فہرست

لمعات:

قانون سازوں کی خدمت میں		3
عشق	صابر صدیقی، پشاور	7
ایک غلط فہمی کا ازالہ	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی	14
حضرت انسان قرآن کے آئینے میں	آصف جلیل، کراچی	23
ملاازم یا مولاازم؟	تنویر مفتی، سویڈن	28
مطالب القرآن فی دروس الفرقان (۲۹واں پارہ)	غلام احمد پرویزؒ	32

ENGLISH SECTION

Journey of My Life
By Dr. Shaguftaa Tahir, Karachi 1

احادیث نبوی ﷺ

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ہر نبی کو بقدر ان لوگوں کے جو اس پر ایمان لائے معجزے دیئے گئے لیکن میرا معجزہ وہ وحی (قرآن) ہے جو خدا نے مجھ پر بھیجی ہے۔ (چونکہ یہ معجزہ دائمی اور تمام نوعِ انسان کے لئے ہے) اس لئے مجھے امید ہے کہ سب انبیاء سے زیادہ قیامت کے روز میری امت ہوگی۔ (بخاری، باب فضائل القرآن)۔

حضور رسالتمآب ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنا دے اور وہ لوگوں کی ضروریات اور احتیاجات سے لاپرواہی برتے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کی طرف سے لاپرواہی برتے گا۔ (ابوداؤد)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمحات

قانون سازوں کی خدمت میں

مملکتیں وجود میں آتی ہیں، مملکتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ سلطنتیں قائم ہوتی ہیں، سلطنتیں فنا ہو جاتی ہیں۔ حکومتیں بنتی ہیں، حکومتیں ٹوٹتی ہیں۔ یہ تاریخ کی گردشِ دولابی ہے جو شروع سے آج تک جاری وساری ہے۔ حکومتوں کے نفع بخش کارناموں کی یاد، ان کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی لوگوں کے ذہن میں رہتی اور زبان پر آتی ہے۔ ان کے مظالم کا رونا خود ان کی موجودگی میں بھی رویا جاتا ہے۔ ان کے مرتب اور نافذ کردہ قوانین بھی اپنی مدت العمر ختم کرنے کے بعد صفحۂ تاریخ سے مٹ جاتے ہیں، ان کی جگہ دوسرے قوانین لے لیتے ہیں۔ اس تبدیلی میں کچھ زیادہ عرصہ نہیں لگتا کیونکہ زمانے کے تقاضے جلدی جلدی بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن کوئی حکومت جو لکیریں مذہب کے نام سے کھینچ دیتی ہے ان کی عمر بڑی دراز ہوتی ہے اور (اگر وہ غلط تھیں تو) ان کی تباہ کاریوں کا سلسلہ بھی مدتِ مدید تک جاری رہتا ہے۔ یہ اس لئے کہ مذہب کا تعلق انسان کے لطیف ترین جذبات سے ہوتا ہے اور ان کے پیدا کردہ نقوش مٹتے مٹتے بھی صدیاں لے لیتے ہیں۔

قرآنِ مجید نے اس سلسلۂ محو وثبات کے لئے ایک نئی طرح ڈالی۔ اس نے کچھ اقدار متعین کیں اور کچھ اصول عطا فرمائے ان کے متعلق کہہ دیا کہ **لا تبدیل لکلمٰته**. یہ کبھی تبدیل نہیں ہوسکیں گے۔ **لا مبدل لکلمٰته**. حکومتیں آئیں اور جائیں۔ ان کے آئین و دساتیر بدلتے رہیں۔ لیکن ان ابدی اصول و اقدار کو کوئی حکومت بدل نہیں سکے گی۔ ان کا نام اسلام ہے اور ان کے مطابق قائم کردہ نظام کا نام الدّین۔ الدّین کے یہ اصول واقدار غیر متبدل رہیں گے، ان کے نفاذ کے طور طریق بدلتے جائیں گے۔ جس حکومت کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوگا، وہ اسلامی حکومت کہلائے گی۔ اگر اسلامی حکومت موجود نہ ہوگی، تو قرآنی اقدار واصول، قرآن کے صفحات میں محفوظ رہیں گے اور ان کے نفاذ کے لئے جو طرق واسالیب (سابقہ) اسلامی حکومت نے وضع اور نافذ کئے تھے ان کی اسلامی حیثیت ختم ہو جائے گی۔ ان کی حیثیت، مذہبی رسوم ومناسک کی رہ جائے گی۔ یہ وہ قدرِ مشترک ہوگی جس کے ساتھ تمسک، یا جس کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے سے۔ اتنا ہی ہوگا کہ اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والی قوم کا تشخص باقی رہے گا۔ ان رسوم ومناسک کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لینا انہیں کتاب

اللہ کے ہم پلہ قرار دینا ہوگا جو شرک ہے۔

اسلامی حکومت' حضور نبی اکرم ﷺ کے عہدِ ہمایوں میں قائم ہوئی اور کچھ عرصہ بعد تک باقی رہی۔ اس حکومت میں حکمرانی صرف کتاب اللہ کی تھی۔ کتاب اللہ کے احکام واصول واقدار کو نافذ کرنے کے لئے جو طور طریق اختیار کئے گئے تھے (جنہیں آپ جزئی قوانین شریعت کہہ لیجئے) انہیں نہ غیر متبدل قرار دیا گیا تھا نہ انہیں علیٰ حالہٖ قائم رکھا گیا۔ یہ وجہ تھی کہ اس دور میں کتاب اللہ کی حفاظت کا تو اس قدر اہتمام کیا گیا لیکن ان جزئی قوانین کو نہ کہیں مرتب و مدون کیا گیا' نہ ان کی حفاظت کا کوئی انتظام کیا گیا۔ انہیں زمانے کے تقاضوں کے تحت بدلتے رہنا تھا اس لئے انہیں منضبط کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔۔۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ احادیث رسول اللہ ﷺ یا عہدِ خلافت راشدہ میں جاری کردہ احکام کا کوئی مجموعہ اس زمانے میں ضبطِ تحریر میں نہیں لایا گیا' تو اس کی وجہ ہی یہ تھی۔ جس چیز کو غیر متبدل رہنا تھا (یعنی کتاب اللہ) اس کی نشر واشاعت اور نظم وضبط کا انہوں نے ایسا اہتمام کیا کہ (امام ابنِ حزمؒ کے قول کے مطابق) عہدِ فاروقؓ میں مملکت میں قرآنِ مجید کے قریب ایک لاکھ نسخے پھیلے ہوئے تھے لیکن اس دور کے بدلتے رہنے والے احکام کی ایک چٹ بھی کہیں نہیں ملتی۔

اس کے بعد بنو امیہ کا دور آیا۔ اس دورِ حکومت کا جو نہایت بھیانک نقشہ تاریخ میں کھینچا گیا ہے' ہم سرِ دست اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ ہم اس کی صرف ایک خصوصیت کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ انہوں نے بھی اپنے احکامِ حکومت کا کوئی ضابطہ مرتب نہیں کیا اور جب مرتب ہی نہیں کیا تو اس کی حفاظت کا سوال بھی پیدا نہیں ہوا۔ اس دور میں نہ کسی خاص فقہی مذہب کا نشان دیکھیں گے' نہ فقہی قوانین کے کسی مجموعہ کا تذکرہ۔ انہوں نے بھی قرآن ہی کی حفاظت کی اور اسی کو آگے پہنچایا۔ یہ وجہ ہے جو اس دور میں نہ امت میں فرقے پیدا ہوئے' نہ فرقہ وارانہ فقہیں وجود میں آئیں۔

اس کے بعد عباسی دور ہمارے سامنے آتا ہے جو سابقہ ادوار سے بالکل ہٹا ہوا ہے۔ ان کی حکومت بھی اسلامی نہیں تھی کیونکہ ملوکیت اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں جو یک جا ہو ہی نہیں سکتے۔ لیکن اس دور میں مختلف فقہیں مرتب ہوئیں۔ ان کی وجہ سے امت مختلف فرقوں میں بٹ گئی۔ توحید نام تھا ایک کتاب اللہ کی حکمرانی کا۔ جب اس کی حکمرانی نہ رہی تو امت میں توحید بھی باقی نہ رہی۔۔۔ توحید تو ایک طرف' امت کی وحدت بھی باقی نہ رہی۔ وہ حنفی' شافعی' حنبلی' مالکی وغیرہ گروہوں میں بٹ گئی۔ یہی وہ فرقہ بندی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے شرک قرار دیا تھا۔ جوں جوں یہ دور آگے بڑھتا گیا' امت کا انتشار' خلفشار' افتراق' اختلاف بھی زیادہ ہوتا گیا۔ اب امت کا کوئی فرد' صرف مسلم کے نام سے پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اسے بتانا پڑتا تھا کہ کونسا مسلمان۔۔۔ شیعہ' سنی' اہلِ حدیث' اہلِ فقہ' حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی (اور نہ جانے کتنی اور اضافی نسبتیں)۔

عباسی دورِحکومت ختم ہوگیا لیکن اس دور میں پیدا شدہ مختلف فقہیں اوران کی نسبت سے مختلف فرقے آگے چلتے گئے۔اب انہی فقہوں کا نام اسلام ہےاوران کے پیروؤں کا نام مسلمان۔اورنظامِ حکومت' ملوکیت۔یعنی مسلمانوں کی زندگی' اصول اورفروع' دونوں اعتبار سے خلافِ اسلام! یہ فقہی احکام چونکہ زمانے کے بڑھتے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے' اس لئے فطرت کے اٹل قانون کے مطابق یہ آہستہ آہستہ مٹتے جارہے تھے۔اس کی جگہ مسلمان مملکتوں نے اپنے یہاں سیکولرنظام رائج کرلیا۔یعنی قرآن کی طرف وہ پھر بھی نہیں آئیں۔قرآن کی طرف وہ آ بھی نہیں سکتی تھیں۔ قرآن تو ہرقسم کی شخصی حکومت کومٹانے کے لئے آیا تھا۔

مدت سے مسلمانوں کے نظامِ اجتماعی کی یہی صورت ہے۔۔۔یعنی نظامِ حکومت یا ملوکیت یا سیکولر ہے' اوراس میں شخصی قوانین کی حدتک کسی نہ کسی فقہ کے احکام کارفرما۔قرآن کا مصرف' صرف یہ رہ گیا ؎

کہ از یٰسینِ او آساں بمیری

(یعنی قرآنِ کریم کی سورہ یٰسین کا فائدہ یہ ہے کہ اس کو پڑھنے سے مسلمان کی جان آسانی سے نکل جاتی ہے)

اس صورتِ احوال کی شدتِ احساس کا نتیجہ تھا کہ علامہ اقبالؒ نے ایک ایسی جدید مملکت کا تصور دیا جس میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہواوراس طرح اسلام اپنی حقیقی شکل میں پھر سے دنیا کے سامنے آسکے۔علامہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ دونوں نے اس امر کی وضاحت کردی تھی کہ اس مملکت میں قرآنی قوانین نافذ ہوں گے۔لیکن ہماری بدقسمتی کہ جب یہاں قانون سازی کا وقت آیا تو نہ علامہ اقبالؒ موجود تھے نہ قائدِاعظم علیہ الرحمتہ۔

ہم مملکت پاکستان کی قانون سازوں اور قانون دانوں کی خدمت میں قیام پاکستان کے باسٹھویں برس میں ایک بار پھر یہ واضح کردینا چاہتے ہیں آئینِ پاکستان کوصرف اورصرف قرآن کے تابع کرلیں اوراس سلسلے میں ایک ترمیمی بِل پیش کریں۔ہماری ان گذارشات کا مقصدصرف یہ ہے کہ ہم بارگاہِ خداوندی میں بری الذمہ ہوسکیں کہ: أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي (7:62)-ہم نے پیغاماتِ خداوندی آپ حضرات تک پہنچادیئے تھےاورآپ بارگۂ خداوندی میں یہ عذرپیش نہ کرسکیں۔ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ (7:172)-ہمیں ان باتوں کا علم نہیں تھا۔ہمیں کسی نے بتایا ہی نہیں تھا۔۔۔فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ (40:44)-اگرآپ آج اسے قابل غورنہیں سمجھتے تو ایک وقت آئے گا جب آپ ان باتوں کو یاد کریں گے۔باقی رہے ہم سواس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے بعد ہم اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتے ہیں۔إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ (40:44)-

قائدِ اعظمؒ اور چیف جسٹس

18/8/1947 کو گورنر جنرل کی تقریب حلف وفاداری تھی قائداعظمؒ آئے اور سیدھے گورنر جنرل کی سیٹ پر جلوہ افروز ہو گئے۔ جسٹس سر عبدالرشید نے پہلو بدلا اور قائداعظم کے سیکرٹری کو اشارہ کیا اور بلا کر ان کے کان میں کہا کہ قائداعظم گورنر جنرل کی کرسی پر بیٹھ گئے ہیں یہ پروٹوکول کی کھلی خلاف ورزی ہے' ابھی انہوں نے حلف نہیں اٹھایا وہ اس نشست کے حقدار حلف اٹھانے کے بعد ہی ہو سکتے ہیں۔ وہ روک سکتے تھے ٹوک سکتے تھے' سرزنش کر سکتے تھے سزا دے سکتے تھے وہ سر عبدالرشید ہی تھے۔

قائد ملت لیاقت علی خاں نے ان کو چائے پر بلایا' وزیراعظم کا خصوصی ایلچی درخواست لے کر حاضر ہوا' چیف جسٹس کو اطلاع دی گئی' سر عبدالرشید نے اس ایلچی کے ہاتھ پیغام پہنچوایا' میں معافی چاہتا ہوں' چیف جسٹس کو وزیراعظم کے ساتھ چائے نہیں پینی چاہئے' جس کی عدالت میں حکومت کے مقدمات پیش ہوئے ہیں' ایلچی چلا گیا تو اپنے سٹاف کو حکم دیا کہ آئندہ اس قسم کی دعوت آئے تو میرے نوٹس میں لائے بغیر ہی معذرت کر دی جائے۔

چیف جسٹس کارنیلیس نے پوری زندگی ہوٹل کے ایک کمرے میں گذار دی' اصول کا یہ عالم تھا کہ لاہور بار کونسل نے سالانہ عشائیہ دیا' چیف جسٹس کو دعوت دی گئی' پوچھا' وہاں کون کون ہوگا' بتایا گیا کہ فیلڈ مارشل ایوب خان ہوں گے' پوچھا میں کہاں بیٹھوں گا' بتایا گیا کہ آپ صدر صاحب کے ساتھ بیٹھیں گے' آپ نے انکار کر دیا' درخواست کی گئی کہ پروٹوکول کا تقاضا ہے اس میں ردوبدل خلاف قانون سمجھا جائے گا' فرمایا میں ان کے ساتھ بیٹھ تو جاؤں گا مگر میری تصویر ہرگز نہ کھینچی جائے' پوچھا کہ اس میں کیا مصلحت ہے فرمایا کہ عدالت میں فیڈریشن کے خلاف کیس آتے ہیں اگر یہ تصویر چھپ گئی تو عدالت کی غیر جانبداری کو نقصان ہوگا' لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے گا۔ چیف جسٹس' قاضی القضاح ایک ہی عہدہ کے دو نام ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صابر صدیقی، پشاور

عشق

علامہ اقبالؒ کے تصورات میں خودی کے بعد لفظ عشق اور فقر کا ذکر ہے جن کے بغیر خودی کو استحکام حاصل نہیں ہوسکتا۔ لیکن انہوں نے لفظ عشق کو اپنی نگارشات میں ایک کثیر المعانی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ لفظ اردو اور فارسی ادب میں گوناگوں رنگ لئے ہوئے ہے۔ مولانا صلاح الدین مرحوم اپنی کتاب تصورات اقبال میں لکھتے ہیں۔

''اقبال کا عشق ایک تراشیدہ ہیرا ہے جس کا ہر پہلو ایک بے مثال آب و تاب کا سرمایہ دار ہے اور جس کا پرتو دنیا کے قلب و نظر میں ایک کیفیت نایاب پیدا کرتا ہے۔ وہ بہ یک وقت ایمان بھی ہے اور عمل بھی، نیازمندی بھی ہے اور بے نیازی بھی، درد بھی ہے اور دوا بھی، فقر بھی ہے اور تونگری بھی، صبر بھی ہے اور جدل بھی، صلابت بھی ہے اور سپردگی بھی اور ان تمام کیفیتوں کے باوصف نہ کوئی اس کی مستقل حدود ہیں اور نہ اس کی کوئی جامع مانع تعریف و تشریح پیش کی جاسکتی ہے۔ بس یوں سمجھنا چاہیے کہ آدم خاکی جب اس جذبہ سے سرشار ہوجاتا ہے تو آسمانوں کی رفعتیں اس پر آسان اور آفاق کی حدود تحلیل ہو جاتی ہیں اور وہ ان پابندیوں اور گراں بار زنجیروں سے آزاد ہوجاتا ہے جنہیں خوف جنم دیتا ہے اور شعور حساب و شمار نافذ و عائد کرتا ہے۔''

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اور فارسی ادب میں یہ لفظ کن کن معنوں میں استعمال ہوا ہے اور ہمارے نزدیک اس جذبے کی حقیقت کیا ہے۔ جب کوئی شاعر ادیب، صوفی یا فلسفی اس لفظ کو استعمال کرتا ہے تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے، میر تقی میر کے والد محترم نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ:

''بیٹا مسلک عشق اختیار کرو''

لیکن بیٹے نے کہا کہ:

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

مولانا حالی فرماتے ہیں کہ:

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

مرزا غالب فرماتے ہیں:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

ایک دوسری طرف سے آواز اٹھی:

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

عراقی نے کہا:

بہ عالم ہر کجادرد و غمے بود
بہم کردند و عشقش نام کردند

دوسری طرف سے کسی نے کہا:

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مولانائے روم فرماتے ہیں:

شاد باش اے عشق خوش سو دائے ما
اے طبیب جملہ علتہائے ما

دوسری جگہ زمان و مکاں کے زنداں خانہ کی دیواروں کو منہدم کرنے والی اس قوت کے متعلق فرماتے ہیں:

عقل گوید شش حداست وہیچ بیروں راہ نیست
عشق گوید ہشت راہ و رفتہ ام من بار ہا

خواجہ معین الدین چشتیؒ سے ایک شعر منسوب ہے:

عشق از لا مکاں نزول کند
دردل عاشقاں نزول کند

یعنی عشق کوئی ایسی قوت یا جذبہ ہے جو صرف عاشقان صدق صفا ہی کو میسر آ سکتا ہے

اسی عشق کے متعلق فیضی کا ایک شعر ہے۔ جس کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا تھا کہ فیضی اگر صرف یہی ایک شعر کہہ دیتا تب بھی وہ فیضی ہی ہوتا۔ فرمایا ہے:

کعبہ را ویراں مکن اے دل کہ اینجا یک نفس
گاہ گہے پسماندگانِ عشق منزل می کنند

علامہ اقبال نے اپنی مشق سخن کے ابتدائی دور میں اپنے استاد مرزا داغ کے تتبع میں لفظ عشق کو روایتی معنی میں استعمال کرتے ہوئے کہا تھا:

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

معلوم نہیں کہ محبوب کی آنکھ ہشیار تھی یا نہیں لیکن علامہ خود بہت جلد ہوشیار ہو گئے اور اس کے بعد انہوں نے عشق کے لفظ کو اس کے محترم معنوں میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اس لفظ عشق کو مختلف معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ بانگ درا کے دور اول ہی میں نظم ''عشق اور موت'' میں علامہ نے عشق کو ایک ایسی قوت قرار دیا ہے جس سے موت کو بھی قضا آ جاتی ہے۔ اس قوت کی بدولت نقش حیات مٹ مٹ کر ابھرتا ہے اور اس کی بدولت زندگی ہمیشہ موت کی گھات میں رہتی ہے اور جہاں کبھی بھی اسے موت کا سامنا ہوتا ہے زندگی آگے بڑھ کر موت کی گردن دبوچ لیتی ہے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی قوت نہیں۔ مغرب میں اس قوت نے اپنے آپ کو آشکارا کرنے

کے لئے فرانسیسی مفکر برگساں کا انتخاب کیا جس نے اس کا نام Elan Vital یعنی جوشش حیات رکھا مگر اس سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ اسے ایک اندھی قوت سمجھتا ہے، جس کا کوئی مدعا یا منزل نہیں اور کاروانِ زندگی بے منزل ہے۔ لیکن علامہ اقبال کے نزدیک یہ قوت شاہراہ ارتقا پر زندگی کی راہنمائی کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ یہی قوت عشق ہے جس نے بے حس مادہ سے زندگی پیدا کی جو اولاً نباتات کی صورت میں نمودار ہوئی اور پھر مختلف کروٹیں بدلتی حیوانات اور پھر انسان کی شکل میں صورت پذیر ہوئی اور اب انسانی تہذیب وتمدن کی راہنمائی کا فریضہ بھی اسی قوت کے سپرد ہے۔ یعنی قوت عشق کا روان حیات کا جائروسکوپ ہے۔ایک دوسرے فرانسیسی مفکر نے اسے Divine Spark کا نام دیا ہے۔

جائروسکوپ ایک آلہ ہے جو بحری اور ہوائی جہازوں میں نصب ہوتا ہے۔ جہاز کا کپتان یا پائلٹ سمندر یا فضا میں اپنا راستہ متعین کر کے آلات کو Set کر دیتا ہے۔ جب کبھی سمندر میں طوفانی ہواؤں کے تھپیڑوں سے یا فضا میں فضائی آندھیوں کی وجہ سے جہاز اپنے متعین راستے سے ہٹ جاتے ہیں تو جائروسکوپ جہاز کو اپنے متعین کردہ راستہ پر لے آتا ہے۔

کروڑوں سالوں سے زمین اپنے مدار پر گھوم رہی ہے اور اس کی رفتار اور مدار میں سرِ مو فرق نہیں آتا۔ نباتات کی دنیا میں سورج مکھی کا پھول ہمیشہ اپنا رخ سورج کی طرف رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ سب قوت حیات یا قوت عشق کا کرشمہ ہے۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو یہ شاید جرمن ماہر حیاتیات ڈریش کے متعلق ہے کہ اس نے تجربتہً ایک حاملہ بکری کا پیٹ اسوقت چاک کیا جب کہ جنین نے کوئی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ اس نے جنین کا وہ حصہ کاٹا جو ٹانگ بننے والا تھا اور اسے اس جگہ پیوست کر دیا جو بکری کی دم بننے والا تھا اور اسی طرح دم والے حصہ کو اس جگہ جوڑ دیا جہاں سے ٹانگ والا حصہ کاٹا گیا تھا۔ اس آپریشن کو مکمل کرنے کے بعد اس نے بکری کا پیٹ سی دیا۔ لیکن وقت مقررہ پر جب بکری نے اپنے بچہ کو جنم دیا تو ڈریش یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بچہ صحیح وسالم تھا اور کسی ان دیکھی قوت نے ڈریش کی تخریبی کاروائی پر لات مار دی تھی۔ اس تجربہ نے ثابت کر دیا کہ کائنات کوئی میکانکی کائنات نہیں تھی بلکہ اس کے پس پردہ کوئی دانا وبینا ہستی ہے جو کائنات کا نظم ونسق سنبھالے ہوئے ہے اور اس ہستی کا آلۂ کار یہی قوت عشق ہے جو کائنات یا انسانی معاشرے میں پیدا ہونے والے بگاڑ کو درست کرتی رہتی ہے۔ اسی کے متعلق علامہ نے کہا تھا:

عشق شور انگیز راہر جادہ در کوئے تو برد
بر تلاش خود چہ می ناز دکہ رہ سوئے تو برد

علمائے ارتقا کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا

ہے۔ ایک گروہ مادہ پرستوں کا ہے جن کا دعوی ہے کہ مادہ کائنات میں خود موجود تھا اور زندگی اس مادے سے خود بخود پیدا ہوگئی۔ دوسرا گروہ زندگی یا قوت حیات کو مادے سے علیحدہ ایک مستقل قوت سمجھتا ہے جس نے اپنی نمود کے لئے مادے کو استعمال کیا ہے لیکن زندگی یا مادہ کی حرکت جو قوت حیات سے پیدا ہوتی ہے بے مقصد ہے یعنی کاروان زندگی بے منزل است۔ لیکن تیسرے گروہ کے مطابق ایک دانا و بینا ہستی یعنی اللہ تعالیٰ نے زمان و مکاں اور اس میں موجود مادے کو اور اس کے ساتھ زندگی یعنی قوت حیات کو کسی مقصد کی خاطر وجود بخشا ہے اور مقصد کے حصول کے لئے جو قوت آلہ کار بنائی گئی ہے اسی کو مسلم فلاسفہ اور صوفیا قوت عشق کا نام دیتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے نزدیک کائنات کے عدم سے وجود میں آنے کے بعد قوت عشق نے عناصر کی ترکیب و ترتیب کی جس کے بعد اس کا پہلا کام زندگی کی نمود تھی جس کی بدولت دلدلوں میں روئیدگی پیدا ہوئی جہاں سے متحرک زندگی نے سر نکالا اور بالآخر منزلوں پر منزلیں مارتی ہوئی نوع انسانی کی شکل میں جلوہ گر ہوئی۔ نباتی اور حیوانی زندگی کے ساتھ انسانی زندگی کے متعلق علامہ فرماتے ہیں کہ:

به برگ لاله رنگ آمیزئی عشق
به جان ما بلا انگیزئی عشق
اگر ایں خاکداں را وا شگافی
درونش بنگری خوں ریزئی عشق

مطلب: گل لالہ کی پنکھڑیوں میں سرخی قوت عشق کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور ہماری روح کی گہرائیوں میں تلاش حقیقت کی تڑپ جسے علامہ نے دوسری جگہ آزار جستجو کہا ہے وہ بھی قوت عشق ہی کا کرشمہ ہے۔ اگر کائنات کی پہنائیوں اور زمین کی وسعتوں میں بکھری ہوئی مادی اشیا کا مشاہدہ کرو تو وہاں بھی ہر ذرے میں عشق کی کارفرمائی نظر آئے گی یہاں تک کہ لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں' آسماں پر انجم زاروں اور ستاروں کا خرام' نظام شمسی میں سیاروں کا سورج کے گرد طواف' ذرے کے دل میں پروٹون کے گرد الیکٹرانوں کی اچھل کود، یہ تمام حرکات قوت عشق ہی کے مظاہر ہیں۔ دوسری جگہ علامہ فرماتے ہیں:

به باغاں باد فروردیں دہد عشق
به راغاں غنچہ چوں پرویں دہد عشق
شعاع مہر او قلزم شگاف است
به ماہی دیدہ راہ بیں دہد عشق

مطلب: باغوں گلزاروں' جنگلوں میں ہر جگہ باد بہاری کے جھونکے قوت عشق ہی کی بدولت چلتے ہیں۔ کہساروں کے دامن میں ایسے پھول اور غنچے پیدا ہوتے ہیں جن کا حسن اور جن کی دلربائی ثریا اور پرویں سے بھی زیادہ دلکش ہوتی ہے۔ نظام شمسی کا روشن ترین مرکز یعنی سورج بھی اتنی تب و تاب نہیں رکھتا کہ اس کی روشنی سمندر کی تہہ تک پہنچ جائے اور مچھلیوں کی راہنمائی کرے لیکن سمندر

کی اتھاہ گہرائیوں کی تاریکی میں قوت عشق کی راہنمائی میں مچھلی اپنا راستہ معلوم کر لیتی ہے۔

یہاں تک تو بات طبعی اور نباتی اور حیوانی زندگی کے متعلق تھی۔ علامہ کے نزدیک قوت عشق ایک تہذیبی اور اخلاقی قوت بھی ہے۔ زبور عجم کی ایک غزل میں فرماتے ہیں:

لالۂ ایں گلستاں داغ تمنائے نہ داشت
نرگس طناز او چشم تماشائے نداشت
خاک را موج نفس بود و ولے پیدا نبود
زندگانی کاروانے بود و کالائے نداشت

پوری غزل پڑھنے اور پڑھ کر سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس غزل میں علامہ فرماتے ہیں کہ کرہ ارض پر ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ یہاں بڑے بڑے جنگلات تھے جہاں سایہ دار درختوں کے ساتھ گل لالہ نرگس ونسترن گلاب اور یاسمین کے پھول کھلتے تھے۔ مرغزاروں میں ہر قسم کے جانور ہاتھی، ریچھ، شیر، گھوڑے، بکری گائے، ہرن وغیرہ سب قسم کے جانور موجود تھے۔ پورے کرہ ارض پر فطرت نے حسن فراواں بکھیر رکھا تھا لیکن اس حسن کے نظارہ سے کیف ومستی میں ڈوب جانے والی آنکھ موجود نہ تھی، یعنی ابھی نہ تو انسان پیدا ہوا تھا اور نہ ہی انسان کا سب سے بڑا دشمن یعنی شیطان پیدا ہوا تھا۔ انسان کے پیدا ہونے سے پہلے کرہ ارض ایک قبرستان سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا لیکن۔

عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں بزم خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

کرہ ارض پر نسل انسانی کے وجود میں آتے ہی قوت عشق پر طبعی نامیاتی اور حیوانی زندگی کے ارتقا کے ساتھ انسانی تہذیب وتمدن کو پروان چڑھانے کی ذمہ داری آن پڑی۔ شاہراہ ارتقا پر ہر پیدا ہونے والی انسانی تہذیب آگے بڑھتے ہوئے ترقی کرنے کی کوشش کرتی تو شیطان سنگ راہ بن کر اس کا راستہ روک لیتا۔ لیکن عشق کی قوت اسی سنگ راہ کو سنگ زینہ بنا کر تہذیب کو آگے بڑھا دیتی۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے علامہ نے فرمایا ہے کہ:

صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر وحنین بھی ہے عشق

مولانا امین احسن اصلاحی اپنی کتاب ''تدبر قرآن'' میں صدق کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کسی شے کا بالکل واقعہ کے مطابق واقع ہونا۔ اس کی روح میں پختگی اور ٹھوس پن ہو۔ زبان دل سے ہم آہنگ ہو۔ عمل اور قول میں مطابقت، ظاہر اور باطن ہم رنگ ہوں، عقیدہ اور فعل دونوں ہم عناں ہوں۔ یہ باتیں صدق کے مظاہر میں سے ہیں اور انسانی زندگی کا سارا ظاہر و باطن انہی سے روشن ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان کی ساری معنویت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی چیز ہے جو انسان کو وہ پرواز عطا کرتی ہے

جس سے وہ روحانی بلندیوں پر چڑھتا ہے اور اس سے اس کے صبر کو بھی سہارا ملتا ہے۔ اسی کتاب میں مولانا اصلاحی صبر کے متعلق لکھتے ہیں کہ صبر کے اصل معنی روکنے کے ہیں یعنی نفس کو گھبراہٹ' مایوسی اور دل برداشتگی سے بچا کر اپنے موقف پر جمائے رکھنا۔ قرآن مجید میں اس حقیقت نے کچھ زیادہ پاکیزہ صورت اختیار کر لی ہے۔ یعنی قرآن میں اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ بندہ پوری طمانیت قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عہد پر ڈٹا رہے اور اس کے وعدوں پر یقین رکھے اور اس راہ میں اس کو جن مشکلات سے دو چار ہونا پڑے ان کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہ دے۔ اسی کتاب میں دوسری جگہ فرماتے ہیں صبر کی حقیقت نرم گرم ہر طرح کے حالات میں حق پر جزم و استقامت ہے۔ غربت' بیماری' مصیبت' مخالفت جنگ غرض جس قسم کے حالات سے بھی آدمی کو دو چار ہونا پڑے عزم و ہمت کے ساتھ اس کو برداشت کرے ان کا مقابلہ کرے۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے اور اپنے امکان کی حد تک موقف حق پر جمارہے۔

اس صراحت کے بعد کہ صدق اور صبر کیا ہیں ہم اس نتیجہ پر آسانی سے پہنچ سکتے ہیں کہ ان خصوصیات کے بغیر انسانی تہذیب وتمدن میں ترقی ناممکن ہے۔ انسان کا قیام درختوں اور غاروں کی بجائے خواہ وہ بڑے مضبوط قلعوں میں رہے' عالی شان محلات میں رہے یا بڑے بڑے ہوٹلوں میں آرام کی زندگی گزارے صدق وصفا اور صبر واستقلال کے بغیر انسان دوسرے جانوروں کی طرح ایک جانور ہی رہتا ہے۔ صدق وصفا اور صبر استقلال کیا ہیں یہ عشق کی پھلجھڑی سے نکلنے والے روشن شرارے ہیں جن کے بغیر تہذیب وتمدن کا ایوان منور نہیں ہوسکتا۔

دوسری بات معرکہ بدر وحنین کی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی انسانی تہذیب وتمدن اور علم و دانش اور فن نے ترقی کی راہ اختیار کی ہے تو باطل کی قوتیں ہمیشہ اس کی راہ میں روک بن کر صف آرا ہوگئی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود اور فرعون وصاحب ضرب کلیم کی کشمکش کیا تھی حق و باطل کی جنگ۔ ہم اس سے اسی نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہیں کہ انسان کو حق و باطل کی جنگ کے بغیر نہ سطوت داؤدی حاصل ہوسکتی ہے اور نہ ہی شوکت سلیمانی۔ یعنی حق و باطل کی جنگ بھی ارتقائے حیات اور تہذیب وتمدن کی ترقی کے لئے لازمی عنصر ہے۔ علامہ نے بانگ درا میں سوامی رام تیرتھ پر ایک نظم لکھی ہے جس کا ایک شعر یہ ہے:

توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیم عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستی تسنیم عشق

اس شعر سے یہ مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک انسانی معاشرے کی تہذیب کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ حسنہ معاشرے میں وہی کام کرتا ہے جو کام قوت عشق کائنات کے نظم ونسق کے لئے کر رہی ہے۔ عشق ایک مجرد تصور ہے لیکن اخلاق کی درستی

کے لئے جولوگ اسوہ ابراہیمی پرعمل کرتے ہیں وہ مجسم عشق کی تصویر بن جاتے ہیں اور انہی کو انبیاء، صدیقین، صالحین اور شہداء کہا جاتا ہے اور یہی ہستیاں ہیں جو معاشرے کے جہاز کو فساد کے سمندر میں طوفانوں کی زد سے بچانے کے لئے جائروسکوپ کا کام کرتے ہیں اور معاشرے کو تباہی کے سمندر میں غرقاب ہونے سے بچائے رکھتے ہیں۔ ہم یہاں عشق کے متعلق علامہ اقبال کی نظم قرطبہ سے چند اشعار پیش کرتے ہیں کہ عشق کے متعلق ان کا نقطہ نظر معلوم ہو جائے:

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہ حرم عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمہ تار حیات
عشق ہے نور حیات عشق ہے نار حیات

واقعی عشق کے ہزاروں نام ہیں کوئی کہاں تک گنوائے۔ اس کے ہزاروں مقام میں کوئی کہاں تک ڈھونڈے۔ البتہ ہم اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کائنات میں یہی قوت کارفرما ہے جو تخلیقی بھی ہے اور ترکیبی بھی۔ کائنات میں عمل ارتقا کی کارفرما بھی یہی قوت ہے اور انسانی معاشرے میں اس کا ظہور بے شمار طریقوں سے ہوتا ہے جن میں سے نمایاں وہ طریقہ ہے جو ہماری حسن و عشق کی داستانوں میں مذکور ہے۔ جب کبھی مذکورہ جائیروسکوپ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو جائے تو جوان لڑکا پڑوسن کی لڑکی سے تانک جھانک کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ بھی ایک تخلیقی قصیدے کی تشبیب ہوتی ہے۔ اگر عشق کو سمجھنا ہو تو اس کے لئے تو چشم بصیرت کی ضرورت ہے اور اگر کوئی چشم بصارت سے اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہو تو تخلیق پاکستان اس کا بین ثبوت ہے۔ جنگ آزادی کے بعد فاتحین نے مسلمانوں کو ذہنی، سیاسی اور معاشی اعتبار سے اس قدر کچلا تھا کہ یہ قوم باورچیوں، مالیوں اور سائیسوں کا ایک ہجوم بن گئی تھی لیکن ابھی ایک صدی نہیں گزری تھی کہ یہ ہجوم ایک قوم بن کر ایک ملک عظیم کی مالک بن گئی۔ ڈاکٹر امبیدکر نے لکھا ہے کہ:

''جنگ آزادی کے بعد مسلم سیاست جس ڈگر پر چلی اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی غیبی ہاتھ ان کی راہنمائی کر رہا ہے۔'' کون کہہ سکتا تھا علیگڑھ میں ایک چھوٹا سا مدرسہ بڑھتے بڑھتے ایک یونیورسٹی ہی نہیں بلکہ ایک تحریک بن جائے گا اور اسے سرسید اور قائداعظم جیسے راہنما مل جائیں گے۔ یہ قوت عشق ہی تھی جس نے اقبال کو پیدا کر کے اس سے کہلوایا:

نغمہ کجاومن کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہ ہمارا روزانہ کا مشاہدہ ہے کہ ہمارے علماء کرام اور ہمارا مذہبی طبقہ نماز کو مسجدوں میں باجماعت پڑھنے پر بہت اصرار کرتا ہے ان کا خیال ہے کہ مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے سے چالیس گنا ثواب ملتا ہے۔اس سلسلہ میں ایک روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جس گھر میں مرد اذان کے وقت اپنے گھر میں ہی رہیں اور نماز باجماعت کے لئے مسجد کی طرف نہ دوڑیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ اس گھر کو آگ لگا دوں۔ یہ روایت نماز باجماعت کی اہمیت کے لئے پیش کی جاتی ہے لیکن جن حضرات کے سامنے قرآن کریم ہے انہیں بخوبی اندازہ ہے کہ دین کی اساس انفرادی پرستش کے بجائے اجتماعی اطاعت پر ہوتی ہے۔ساری دنیا کے مذاہب کا انحصار ''خدا پرستی اور نیک عملی'' پر ہوتا ہے۔لیکن اسلام دین کی دعوت دیتا ہے اور صرف دینی کام ہی نیک اعمال ہوتے ہیں۔دین کے قیام کے بغیر ''نیک عملی'' سرانجام دینا' اپنے کو اور دوسروں کو غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کے مرادف ہے۔ یہ غلط فہمی صرف اس وقت دور ہوسکتی ہے جب دین اور مذہب کا فرق واضح طور پر آپ کے سامنے آجائے۔

مذہب کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ یہ ایک Subjective Matter ہے۔اس کا انسان کے اندرونی جذبات سے تعلق ہوتا ہے مسلمان حکماء کے علاوہ مغربی مفکرین نے بھی مذہب کی Definition بیان کرنے کی کوششیں کی ہیں لیکن کسی دو مفکرین کی تعریف Definition میں بھی اتفاق نہیں ہے۔ان کے اقتباسات اس لئے نہیں دیئے جاتے کہ اس سے مضمون بہت طویل ہو جائے گا اور مقصد کوئی بھی حاصل نہیں ہوگا۔عموماً مذہب سے مراد یہ ہوتی ہے کہ انسان اس دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی سے الگ کر کے' اس زندگی کو سیاسی لیڈروں کے سپرد کر دے اور آخرت کی زندگی کو پیشوائیت کے حوالہ کر دے۔یعنی خدا کی دنیا الگ اور قیصر کی دنیا الگ قیصر کو اس کا ٹیکس ادا کر دیں اور مذہبی پیشواؤں کو ان کا خراج۔حکومت وقت کی قانون شکنی جرم Crime ہوتی ہے جبکہ مذہب کے احکامات کے خلاف چلنا گناہ Sin کہلاتا ہے۔Crime یعنی جرم کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے جبکہ گناہ (Sin) کی سزا آخرت میں ملے گی۔اسی طرح حکومت وقت کے حکمرانوں کی اطاعت کے ثمرات بھی اسی

دنیا میں مل جاتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی جزا اور اس کے انعامات میں جنت مل جاتی ہے۔ یہ وہ تصور زندگی Concept of Life ہے جس کو مذہب کہا جاتا ہے اور دنیا کے تمام مذاہب انہیں تصورات پر قائم ہیں۔ مذہب کا کوئی تعلق اس دنیا سے نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق صرف اور صرف مرنے کے بعد کی دنیا سے ہوتا ہے۔ اسی لئے مذہب کی صداقت اور بطلان کا کوئی معیار اس دنیا میں نہیں ہوتا۔ کوئی شخص اپنے مذہب کو صحیح اور دوسروں کے مذہب کو غلط ثابت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جو ضابطۂ حیات صرف آخرت کے متعلق ہو اور اس موجودہ Visible دنیا کی زندگی سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو' اس صورت میں آپ اس کی صحت و سقم کا کوئی معیار قائم ہی نہیں کر سکتے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم میں مذہب کا لفظ کہیں استعمال ہی نہیں ہوا ہے۔

مذہب کے بالکل برعکس اور اس کے بالکل برخلاف دین کا تعلق براہ راست اس دنیا سے ہوتا ہے۔ انسانوں کے باہمی معاملات و تنازعات کو وحی الٰہی کے مطابق طے کرنا' دین ہوتا ہے۔ دین میں اطاعت کا مرجع اسی دنیا میں ہوتا ہے۔ جو زندہ اتھارٹی کی شکل میں دینی نظام کو متشکل اور اس کو متمکن کرتا ہے۔ دین میں جرم اور گناہ الگ الگ نہیں ہوتے' اس میں جرم اور گناہ کا بدلہ اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔ دنیا کے وہ تمام امور جن کا فیصلہ وحی الٰہی کی رو سے کیا جائے وہ تمام امور دینی بن جاتے ہیں۔ اگر کسی قیمتی پلاٹ پر دو فریقوں کا تنازعہ ہے۔ اسلامی حکومت اس تنازعہ کا فیصلہ ایک کے حق میں اور دوسرے کے خلاف کر دیتی ہے۔ فریقین کا یہ جھگڑا خالص دنیاوی جھگڑا ہے لیکن جب اسلامی حکومت اس کا فیصلہ وحی الٰہی کی رو سے کر دیتی ہے تو یہ فیصلہ دینی بن جاتا ہے اور اسکی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت بن جاتی ہے۔ ہماری معاشرت میں Sex کراہیت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور بدچلنی یقیناً ایک مذموم فعل ہے لیکن اسی Sex کو جب نکاح کی حدود میں لے آئیں تو یہ وحی الٰہی کے احکامات کے مطابق ہونے کی وجہ سے دینی کام بن جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ اگر میاں بیوی میں اختلافات واقع ہو جائیں تو حکومت کو لازم ہے کہ ان دونوں کی طرف سے حَكَماً مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَماً مِّنْ أَهْلِهَا (4:35)۔ ایک ثالث شوہر کے خاندان سے اور ایک ثالث بیوی کے خاندان سے مقرر کر دے۔ اسلامی حکومت ان دونوں ثالثوں سے پورا پورا تعاون کرتی ہے۔ پھر یہ ثالث جو بھی فیصلہ دے دیں' ان کا فیصلہ دینی ہوگا اور میاں بیوی پر اس کی اطاعت لازمی ہوگی' اور یہ اطاعت' اللہ و رسول کی اطاعت کے مرادف ہوگی۔

جب دو مسلمان گروہوں یا حکومتوں میں تنازعہ واقع ہو جائے تو قرآنی ہدایت کے مطابق ان میں صلح کرانا ضروری ہے۔ وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا (49:9)۔ اور اگر مومنین میں سے دو

گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان دونوں میں صلح کرا دو۔ یہ قرآنی حکم ہے۔اس پر عمل کرتے ہوئے دونوں گروہوں کو اس فیصلہ کو تسلیم کرنا ہوگا۔ چونکہ یہ فیصلہ وحی الٰہی کے حکم کے مطابق ہوگا' اس لئے یہ خالص دنیاوی معاملہ دینی امور میں شمار ہوگا اور اس کی اطاعت اللہ کی عبادت ہوگی۔ گذارش صرف یہ کرنی ہے کہ مذہب کے برخلاف دین کا تعلق اس زندگی سے ہوتا ہے۔ دین ساری زندگی پر حاوی اور محیط ہوتا ہے۔ زندگی کا کوئی معاملہ دین کی حدود سے باہر نہیں ہوسکتا۔

جو وعدے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے کئے ہیں وہ سب دین کے قیام سے وابستہ ہیں۔ دین پر عمل کرنے سے وہ وعدے پورے ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ہر شخص کو رزق فراہم کرتا ہے۔ وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6)- اور زمین پر چلنے والوں میں کوئی ایسا نہیں جس کی روزی خدا کے ذمہ نہ ہو۔ نیز فرمایا: نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (6:151)- ہم تمہیں اور تمہاری اولاد کو رزق دیتے ہیں۔ اپنے بندوں سے کئے ہوئے یہ وعدے اس نظام سے پورے ہوتے ہیں۔

(1) یہاں یہ بات واضح کر دینا غیر مناسب نہیں ہوگا کہ جس رزق کی تقسیم قانون خداوندی کے مطابق نہیں ہوتی وہ رزق کھانا حرام ہوتا ہے قرآن کریم نے جب یہ فرمایا: کہ جو لوگ قانون خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر' فاسق' ظالم ہوتے ہیں۔ تو ان فیصلوں میں معاشی فیصلے بھی شامل ہوتے ہیں۔ جو لوگ رزق کی تقسیم ان فیصلوں کے مطابق نہیں کرتے وہ ان تینوں صفات سے متصف ہوتے ہیں۔ نیز یہ بات بھی خوب ذہن نشین رکھیں کہ اگر دنیا کے تمام مفکرین و دانشور جمع ہو کر بھی ایسا معاشی نظام تشکیل دینا چاہیں جس میں معاشی نظام حیات مستقل اقدار سماوی کے مطابق ہو تو وہ ایسا کبھی بھی نہیں کر سکتے۔ یہ بات ان کے بس کی ہے ہی نہیں۔ یہ نظام حیات صرف نظام ربوبیت کا ہی ہے جو اسلام کا مابہ الامتیاز ہے۔ جس کی نظیر کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی اور یہی قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ یہ نظام باطل پر قائم ہوگا۔ جیسا کہ آج کل ساری دنیا میں معاشی نظام ربوٰ پر قائم ہے۔ اس موجودہ معاشی نظام کا حاصل کردہ ایک ایک لقمہ ہمارے لئے حرام ہے۔ خواہ ہم اس کا احساس کریں یا نہ کریں' یہ حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو' لیکن اس سے چشم پوشی کسی طرح بھی نہیں کی جا سکتی۔

(2) رزق کی فراہمی کے وعدے کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا دوسرا وعدہ یہ ہے کہ ساری دنیا میں صرف مسلمان ہی غالب رہیں گے۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ (63:8)- اس آیہ کریمہ میں لام مصرلگا کر واضح کر دیا ہے کہ عزت صرف اللہ' اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے۔ نیز فرمایا: وَلَن يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى

الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلاً (4:141)-اورخدانے کافروں کو مومنین پر غالب رہنے کی کوئی راہ نہیں چھوڑی۔ اللہ تعالیٰ کے یہ قرآنی وعدے' صرف قرآنی نظام پر عمل کرنے سے پورے ہوتے ہیں۔

(3) اسی طرح انسانوں کی دعائیں بھی اللہ کے نظام کے قیام سے پوری ہوتی ہیں۔ مکہ کے مظلوم مسلمانوں پر جب کفار کا ظلم وتشدد بڑھتا چلا گیا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے ہمارے پروردگار تو ہمیں اس بستی سے نکال دے جس کے رہنے والے اس قسم کے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی نگران اور کوئی مددگار بھیج دے (4:75)۔ خدا کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ ان مظلوموں کی براہ راست مدد کر کے' انہیں وہاں سے نکال لیتا۔لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے مدینہ کی اسلامی حکومت سے کہا کہ اے جماعت مومنین تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں نکلتے۔تم سن نہیں رہے ہو کہ مکہ کے کمزور مرد وعورتیں اور بچے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ پروردگار ہمیں اس بستی سے نکال لے۔ اس آیہ کریمہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مکہ والے اگرچہ خدا کو پکار رہے تھے لیکن خدا براہ راست ان کی دعا کو پورا نہیں کرتا' بلکہ ان کی دعا اسلامی حکومت کی معرفت پوری کرتا ہے۔

اس بارے میں حضرت عمرؓ کا ایک قول بھی بہت پُرمعنی اور چشم کشا ہے۔ اُن جناب نے خلافت کی ذمہ داریوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ: میں یہاں اس جگہ اس لئے بیٹھا ہوں تا کہ تمہاری دعاؤں کو خدا تک جانے سے روک دوں۔ کیونکہ تمہاری ہر دعا میرے خلاف ایک شکایت ہے جس کا پورا کرنا میرا فریضہ ہے۔

(4) اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید بھی اسی نظام کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔فرمایا: إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ (47:7)-(ترجمہ) اگر تم خدا کے دین کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔ نصرتِ خداوندی اور تائید ایزدی کے لئے یہاں شرط لگا دی گئی ہے کہ اگر تم نظام خداوندی کی مدد کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ اس کے نظام کی اعانت کرنا ہے۔

(5) اس نظام کے شرف ومجد اور اس کے عالی مقام کا اندازہ اس بات سے فرمائیں کہ جو امور اسلامی حکومت سرانجام دیتی ہے' اللہ تعالیٰ ان امور کو اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضورﷺ کو جماعتِ مومنین سے خدا کے ساتھ باندھے ہوئے عہد (9:112) کی تجدید کرنی پڑی تو مجاہدین اپنا ہاتھ حضورﷺ کے ہاتھ پر رکھ کر اس عہد کی توثیق کرتے تھے۔ ارشاد ہوا: إِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيْهِمْ (48:10)-(ترجمہ) بے شک

جولوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ لوگ خدا سے ہی بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ انکے ہاتھ پر ہے۔ یہاں خدا نے حضورﷺ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا ہے۔ اسی طرح جنگِ بدر کے بارے میں ارشاد ہوا: ''ان کے خلاف جو تیر تمہاری کمانوں سے نکل رہے تھے' درحقیقت وہ تیر خدا خود چلا رہا تھا'' (8:17)۔ نیز فرمایا کہ: تم انہیں قتل نہیں کر رہے تھے' انہیں خدا خود قتل کر رہا تھا۔ قرآن کریم کی ان آیات سے اسلامی نظام کی عظمت اور اس کی شانِ عالی کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔

یہ مثالیں جناب کی خدمت عالی میں اس بات کو واضح کرنے کے لئے پیش کی گئی ہیں کہ دین کا تعلق اس دنیا سے ہوتا ہے اور وہ ہماری ساری زندگی پر حاوی اور محیط ہوتا ہے۔ اس دین کے درست اور غلط ہونے کا معیار یہ ہے کہ اگر اس نظام سے اللہ کے وعدے پورے ہو رہے ہیں تو یہ نظام درست' صحیح اور حق ہے' اور اگر اس کے یہ وعدے پورے نہیں ہو رہے تو یہ نظام درست نہیں ہے۔ نظام کے نتائج سے اس کے درست یا غلط ہونا ثابت ہو جاتا ہے' جبکہ مذہب کی صحت وسقم کا کوئی معیار اس دنیا میں نہیں ہوتا۔

یہاں تک ''خدا پرستی'' کے متعلق گذارشات و معروضات پیشِ خدمتِ عالی کی گئی ہیں۔ اب نیک عملی کے متعلق عرض ہے کہ نیک عملی بھی صرف دین میں ہی کی جاسکتی ہے اور اس نیک عملی کے نتائج بھی صرف دین میں ہی برآمد ہوتے ہیں۔ اس کے لئے آپ چند مثلہ ملاحظہ فرمائیں۔

(1) اگر بالفرض کوئی آفیسر رشوت لیتا ہے اور وہ اپنے ایک دیانتدار کلرک سے خائف ہے' اور اس خوف کی وجہ سے وہ اس کلرک کو کسی طرح نوکری سے برخواست کرا دیتا ہے لیکن اس کے بعد' وہ کلرک پر رحم کھا کر کبھی کبھی اس کی مالی مدد کرتا رہتا ہے' تو کیا اس کی یہ مالی مدد' نیک عملی' شمار کی جاسکتی ہے۔

(2) ہمارے اس ظالم معاشرے میں کچھ خواتین معاشی مجبوریوں کی وجہ سے ناجائز طریقوں سے مال کماتی ہیں۔ یہ معاشرہ کا سب سے زیادہ ستم رسیدہ اور مظلوم طبقہ ہوتا ہے۔ اگرچہ راقم سطور کا اس کوچہ سے کبھی گذر نہیں ہوا' اس لئے براہ راست ان کی مظلومیت کا مشاہدہ نہیں کیا لیکن اردو زبان میں شورش کاشمیری کی کتاب ''اس بازار میں'' پڑھ کر رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں البتہ انگریزی زبان میں اس طبقہ کے متعلق کافی مواد موجود ہے۔ جس سے ان کی مظلومیت کا خوب اندازہ ہو جاتا ہے' اور اس طبقہ پر بہت رحم اور ترس آتا ہے۔ ان میں بھی خدا پرستی کے جذبات موجود ہوتے ہیں کیونکہ یہ طبقہ دوسرے طبقات سے زیادہ توہم پرست ہوتا ہے' اس لئے محرم کے دوران یہ اپنے سب کام ملتوی کر دیتے ہیں اور محرم میں نذر' نیاز دیتے ہیں۔ یہ نیاز و نذران کی اس آمدنی سے ہوتی ہے' جو وہ چرخہ کات کر کماتی ہیں' اور ان کے نزدیک بالکل حلال ہوتی ہے کیونکہ

ان کو احساس ہوتا ہے کہ ان کی دوسری آمدنی جائز نہیں ہے' ان کی اس تمام مظلومیت کے باوجود کیا اس طرح کی نذر و نیاز ''نیک عملی'' گردانی جا سکتی ہے' اسی طرح بہت سے رشوت خور افسران' رشوت لینے کے باوجود مزاروں اور خانقاہوں پر دیگیں اور چادریں چڑھاتے ہیں کیا یہ رسوم نیک عملی سمجھی جاسکتی ہیں۔

(3) ایک بادشاہ ساری عمر حکومت کرتا ہے جبکہ ملوکیت خود ایک باطل نظام ہے اور قرآن کے خلاف ہے۔ وہ اس باطل نظام کو قائم کرنے میں لوگوں کو قتل بھی کراتا ہے اور عوام الناس کے حقوق بھی پامال کرتا ہے لیکن وہ خود اپنی روزی قرآن کریم کے نسخے اپنے ہاتھ سے لکھنے سے کماتا اور اس روزی پر گذارا کرتا ہے' کیا اس کا اس طرح کی روزی کمانا' اس کے جرائم کے ارتکاب کے مقابلہ میں ''نیک عملی'' شمار ہوسکتا ہے۔

(4) سرگنگا رام نے لاہور میں گنگا رام ہسپتال قائم کیا جس سے بہت سے لوگوں کو فائدہ ہوتا ہے' لیکن یہی سرگنگا رام ساری عمر باطل نظام کا پرزہ بنے رہے اور صحیح اور درست نظام کے قیام میں مانع و حارج رہے وہ نظام خود ساری دنیا کے مریضوں کا علاج کرنا اپنا فرض سمجھتا۔ اس نظام کی مخالفت کرنے کی وجہ سے ہسپتال کا قیام ''نیک عملی'' شمار نہیں ہوسکتا۔

(5) ہمارے علمائے کرام ساری عمر مذہبی رسوم سے وابستہ رہتے ہیں۔ عیدالاضحیٰ پر قربانی کرتے ہیں۔ ربیع الاول کے مہینے میں نہایت الحاح وزاری کے ساتھ نعتوں کی محفلیں سجاتے ہیں' بائیس رجب کے کونڈے کرتے ہیں۔ شبرات میں حلوے تقسیم کرتے ہیں۔ سارے سال وعظ وتبلیغ کے جلسوں میں تقاریر کرتے' ہزاروں روپوں کی رقوم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام کے قیام کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ ان کی ساری مذہبی کدد کاوش میزانِ خداوندی میں ایک پرِکاہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔

آپ کو یاد ہوگا کہ 1857ء کے غدر کے بعد انگریزی حکومت کی نگرانی میں مختلف مذاہب کے علماء کے مابین مناظرے ہوا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں تشدد بالکل نہیں تھا اور مناظروں کا انعقاد بھی حکومت کی زیرنگرانی ہوا کرتا تھا۔ اس لئے تمام فریق حد درجہ علمی معیار قائم رکھتے تھے' ہندو' عیسائی' آریہ' یہ تینوں مذاہب ہیں اور وہ خود بھی اس بات کے معترف ہیں کہ وہ صرف مذہب ہیں' دین نہیں ہیں۔ ہمارے علماء کرام ان سے مذہب کے Level پر مناظرے کرتے تھے' یہ ہمارے علماء کرام کوئی معمولی عالم نہیں تھے' اس وقت کے بلند پایہ علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مولانا قاسم نانوتوی صاحب' مولوی رحمت اللہ کیرانوی صاحب اور دیگر اسی اعلیٰ مقام کے علماء اس میں حصہ لیتے تھے۔ ان کے یہ مناظرے اب بھی مطبوعہ شکل میں موجود

ہیں۔ ان مناظروں کی رودئیداد مطالعہ کی جاسکتی ہے۔ یہ تمام علماء کرام اسلام کو مذہب کی حیثیت سے ہی پیش کرتے تھے۔ اگر ہمارے ان علماء کرام کے سامنے اسلام دین ہوتا تو یہ دعویٰ کرتے کہ اسلام کا نظام' جمہوریت کے نظام سے بہتر ہے اور اسلام کی برتری اور فوقیت بطور ضابطۂ حیات کے ثابت کرتے۔ کہ اسلام کس قدر مثالی معاشرہ قائم کرتا ہے۔لیکن ان کے سامنے دین کا تصور ہی نہیں تھا۔ اب اس دور میں بھی Interfaith Dialogue ہو رہے ہیں۔ ان میں بھی اسلام کو مذہب کی حیثیت سے ہی پیش کیا جاتا ہے۔

اب پاکستان کے قیام کے بعد بھی ہماری پیشوائیت کے نظریہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تحریک طلوع اسلام کے زیراثر یہ حضرات بھی دین کا لفظ دہرانے لگے ہیں اور سلامی حکومت کا مطالبہ بھی کرنے لگے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ان کے مدارس میں وہی نصاب پڑھایا جاتا ہے جو مذہب کا داعی ہے' اس لئے ان کے ذہن میں دین کا واضح تصور نہیں آ سکتا۔ وہ عجب کشمکش اور گومگو کی حالت میں مبتلا ہیں۔تحریک طلوع اسلام کا پیش کردہ نظامِ حیات انہیں اپیل کرتا ہے' لیکن ان کا ذہن اس کے خلاف بنا ہوا ہے۔ اس بات کی وضاحت ان کے عمل سے ہوتی ہے۔ یہ ہمارے علماء کرام انفرادی صلوٰۃ کے قائل ہیں جیسا کہ عرض کیا گیا ہماری باجماعت نماز بھی انفرادی نماز ہی ہوتی ہے۔انفرادی صلوٰۃ اور اجتماعی صلوٰۃ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ یہ دونوں صلوٰۃ بالکل دو متضاد تصورات کی نمائندگی کرتی ہیں۔انفرادی صلوٰۃ کے معنے ذاتی پرستش کے ہوتے ہیں جبکہ اجتماعی صلوٰۃ کے معنے یہ ہیں کہ فرد کی ذات کی نشوونما اور اس کی ذات کا ارتقاء صرف معاشرے کے اندر ہوسکتا ہے۔ بغیر اسلامی معاشرے کی انفرادی طور پر ذات کی تربیت نہیں ہوسکتی۔قرآن کریم کی اطاعت صرف معاشرے کے اندر ہی ہوسکتی ہے۔ انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ انفرادی صلوٰۃ اور اجتماعی صلوٰۃ اپنی اصل و بنیاد کے اعتبار سے متضاد تصورات پر مبنی ہیں قرآن کریم اجتماعی صلوٰۃ کا داعی ہے۔اس میں انفرادی صلوٰۃ (انفرادی پرستش) کا تصور نہیں ملتا۔ یہ ہمارے علماء کرام جب نماز کے پابند نظر آتے ہیں تو اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے سامنے اجتماعی صلوٰۃ یا اسلامی نظام کا تصور نہیں ہوتا۔

البتہ یہ بات کہ انسانی ذات کی نشوونما صرف معاشرے میں ہوتی ہے۔ یا اجتماعی صلوٰۃ سے ہوتی ہے یا دوسرے الفاظ میں عبادت الٰہی بھی انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی' یہ سمجھنے کی بات ہے۔ انسانی ذات کی تربیت مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔اس کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اور مستقل اقدار پر عمل معاشرے میں ہوسکتا ہے' گوشوں اور زاویوں میں ان پر عمل نہیں ہوسکتا۔فرض کیجئے ایک آفیسر کو اپنے بیٹے کو کالج میں داخلہ دلانا ہے' لیکن اس کے پاس

بالکل کوئی رقم نہیں ہے۔ وہ بالکل مجبور ہے' اسی دوران کوئی سائل اس کے پاس آیا اور اس نے اس کو اپنے کام کرانے کے عوض کچھ رقم پیش کر دی۔ اب یہاں ذاتی مفاد اور مستقل قدر میں Tie آ پڑتی ہے۔ اگر اس آفیسر نے رشوت لے لی اور اپنے بیٹے کو کالج میں داخل کرا دیا' تو اس کی ذات میں اضمحلال آ جائے گا لیکن اگر اس نے اپنا ذاتی مفاد پیش نگاہ نہیں رکھا اور رشوت لینے کے بجائے مستقل قدر پر عمل کیا' تو اس کی ذات کی نشوونما ہو گی۔ ذات کی نشوونما معاشرہ میں ہوتی ہے۔ گوشوں اور زاویوں میں ذاتی مفاد اور مستقل قدر میں تصادم ہی پیش نہیں آ سکتا۔

اس کے برخلاف اگر آپ کسی باطل نظام میں رہ رہے ہیں۔ اس میں بھی آپ کی ذات کی نشوونما نہیں ہو سکتی۔ باطل نظام میں آپ لاکھ چاہیں کہ آپ ربٰو سے بچ جائیں۔ آپ ربٰو سے کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ آپ رزق کی غیر خداوندی تقسیم سے کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ ربٰو کھانا' اللہ و رسول سے جنگ کرنا اور اللہ سے بغاوت کرنے کے مرادف ہے۔ جو شخص اللہ اور رسول سے جنگ آزما ہے' اس کی تربیتِ ذات کسی طرح بھی نہیں ہو سکتی۔ اس نظام کا باطل پر استوار ہونا اور آپ کا اس کے اندر بخوشی رہنا اور جگہ جگہ' قدم قدم پر مستقل اقدار کی خلاف ورزی کرنا' خود اتنا بڑا جرم ہے کہ اس میں ذات کی تربیت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس میں عبادت الٰہی کرنے کا تصور ہی بے سود ہے۔ اس میں اجتماعی صلوٰۃ کا قیام ہو ہی نہیں سکتا۔ اس میں صرف نمازیں ہی ادا ہو سکتی ہیں اور اس میں ''خدا پرستی اور نیک عملی'' ہی ہو سکتی ہے۔ اس میں اعمال صالح نہیں ہو سکتے جو اصل میں نیکی ہوتے ہیں۔

قرآن کریم نے دین کو کلمۃً طیبۃً سے مثال دی ہے (14:24)' خوش گوار نظریۂ زندگی' بہترین ضابطۂ حیات' جس کی جڑیں مستحکم ہوں اور جس کی شاخیں فضا میں جھوم رہی ہوں۔ اس کلمۂ طیبہ (اسلامی حکومت) کے متعلق فرمایا کہ: **إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ** (35:10)- اور اس کی طرف صعود کرتا ہے پاکیزہ کلمہ اور عمل صالح اس کو سہارا دیتا ہے۔ اس کلمۂ طیبہ (یعنی اسلامی نظام) کو جو چیز سہارا دیتی ہے اور رفعت بخشتی ہے وہ عمل صالح ہوتا ہے عمل صالح کے بغیر یہ کلمہ طیبہ (دین) مرجھا کے رہ جاتا ہے۔ گویا دین الٰہی کی مثال انگور کی بیل کی طرح ہے جو اگرچہ خود بھی ثمر بار ہے لیکن اس کی شادابی اور ثمر باری میں عمل صالح سے اضافہ ہوتا ہے۔ عمل صالح ہی اس کو پروان چڑھاتا ہے۔ اس آیۂ کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ ہر وہ عمل جو کلمہ طیبہ (دین) کو سہارا دے اور اس کو بلند کرے' وہ عملِ صالح ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے خود اس آیت میں عمل صالح کی وضاحت فرما دی ہے کہ عمل صالح وہ عمل ہوتا ہے جو دین کی تقویت اور اس کے سہارے کا باعث بنتا ہے۔

قرآن کریم کی رو سے قرآن کے ہر حکم کی اطاعت عبادت ہے اور ہر عبادت حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ باطل نظام کے احکامات کی اطاعت عبادت نہیں ہوتی جبکہ اسلامی حکومت کے ہر حکم کی اطاعت عبادت ہوتی ہے۔ اسے آپ ایک آسان مثال سے سمجھیں۔ باطل نظام میں اگر آپ ٹریفک سگنل کو عبور نہیں کرتے' تو آپ حکومت کی اطاعت تو کرتے ہوتے ہیں' لیکن اللہ ورسول کے ہاں اس کا کوئی درجہ نہیں ہے جبکہ آپ نے اگر اسلامی حکومت میں سرخ سگنل کو عبور نہیں کیا تو آپ اللہ ورسول کی اطاعت کر رہے ہوں گے۔ کیونکہ اسلامی حکومت کے ہر حکم کی اطاعت عبادت ہوتی ہے۔ اب اس مثال کو ایسی ساری زندگی پر محیط کر لیں تو اس طرح اسلامی حکومت میں آپ رات دن عبادت الٰہی میں مصروف ہوں گے اس طرح اسلامی حکومت میں آپ کی ذات کی تربیت اور نشوونما ہر وقت ازخود ہوتی رہتی ہے جبکہ باطل نظام میں ایسا نہیں ہوتا' اس میں اس کا بالکل برعکس اور برخلاف ہوتا ہے کہ اس میں آپ کی ذات ازخود مضمحل ہوتی چلی جاتی ہے۔

یہ چند سطور' جن کو مثالوں سے حد درجہ آسان کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس لئے تحریر کی گئی ہیں کہ ان سے دین کے قیام کی ضرورت واضح ہو جائے اور اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے کہ ہمارے مذہبی امور دینی امور کا نعم البدل ہو سکتے ہیں۔

نوٹ:- نماز پنجگانہ سے متعلق ادارہ طلوع اسلام کا موقف اور نقطۂ نظر آئندہ شمارہ میں ''نماز کی اہمیت'' کے زیرعنوان ملاحظہ فرمائیے۔ (ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آصف جلیل، کراچی
asif.jalil1@gmail.com

حضرت انسان قرآن کے آئینے میں

(قسط۱۰)

وَ مَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ☆ وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ (34:34-35)۔

اور ہم نے تو جس بستی میں جو بھی آگاہ کرنے والا بھیجا وہاں کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا کہ جس چیز کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کے ساتھ کفر کرنے والے ہیں۔ اور کہا ہم مال و اولاد میں بہت بڑھے ہوئے ہیں یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم عذاب دیئے جائیں۔

ان آیات میں پھر یہ بات آئی ہے کہ مخالفت کرنے والے عام طور پر خوشحال لوگ ہوتے ہیں جو کثرت مال کے ساتھ ساتھ اولاد زیادہ ہونے کا غرور بھی کرتے ہیں۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ان کو عذاب نہیں ہوگا۔ کیا یہی سوچ آج کل کے نام نہاد مسلمانوں میں نہیں رچ بس چکی؟ قطع نظر اس کے کہ دولت کیسے حاصل کی گئی ہو، کیا عمرے، حج، قربانیاں وغیرہ کرنے کے بعد یہی اطمینان نہیں حاصل ہو جاتا کہ اب میرے گناہ معاف ہوگئے ہیں؟ اس سے غریبوں کے دلوں میں یہ خیال تو ضرور آتا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مال دار لوگوں سے رعایت کرتا ہے۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی بات کی ہی نہیں۔ بلکہ ایسا کرنے والوں کو بتا دیا گیا ہے کہ ان کے اس طرح کے اعمال رائیگاں جائیں گے۔ یعنی نہ اس دنیا میں ان کا کوئی نتیجہ نکلتا ہے نہ اُخروی زندگی میں ان کا کوئی فائدہ ہوگا۔

اِنَّ هٰذَآ اَخِیْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ اَكْفِلْنِیْهَا وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ (38:23)۔

یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنبی ہے لیکن یہ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اپنی یہ ایک بھی مجھ ہی کو دے دے اور مجھ پر بات میں بڑی سختی برتتا ہے۔

یہاں بہت حسین انداز میں سرمایہ دارانہ ذہنیت کی عکاسی کی

گئی ہے۔جس کے پاس پہلے ہی بہت زیادہ ہوتا ہے اس کا پیٹ نہیں بھرتا اور اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ دوسروں کے منہ سے ایک نوالہ بھی چھین لے۔بعض اوقات حیرانی ہوتی ہے کہ ایک شخص کروڑوں کا مالک ہوتا ہے لیکن وہ کسی غریب سے کام لیتے ہوئے چند روپوں کے لئے بھاؤ تاؤ کر رہا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں حکومت کے سربراہ سے لے کر حکومتی اداروں کے ہر سطح کے ملازمین سرمایہ جمع کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں چاہے یہ قومی دولت سے لوٹا جائے یا عوام کی جیبوں سے۔اسی طرح کاروباری لوگوں کا حال ہے۔

وَاِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَحْدَہُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لاَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ وَاِذَا ذُکِرَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖ اِذَا ھُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ (39:45)۔

جب اللہ اکیلے کا ذکر کیا جائے تو ان لوگوں کے دل نفرت کرنے لگتے ہیں جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے اور جب اس کے سوا ذکر کیا جائے تو ان کے دل کھل کر خوش ہو جاتے ہیں۔

آج بھی لوگوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے جب صرف قرآن کریم کی بات کی جائے تو انہیں ناگوار گزرتا ہے۔ابتدائی انسانوں سے لے کر آج تک یہی روش ہے کہ اللہ کی بات کو رد کرنے کے لئے یہ طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے۔کوئی دلیل تو ہوتی نہیں ہے اس لئے جذباتی حربے استعمال کئے جاتے ہیں کہ دیکھو یہ آپ کے بزرگوں کی باتوں کو رد کر رہا ہے۔ ایسی محفلیں سجائی جاتی ہیں جن میں گزرے ہوئے بزرگوں کی روایات وحکایات بیان ہو رہی ہوتی ہیں اور لوگ خوشی سے نعرے بلند کر رہے ہوتے ہیں۔

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰہُ نِعْمَۃً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ بَلْ ھِیَ فِتْنَۃٌ وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لاَ یَعْلَمُوْنَ (39:49)۔

انسان کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارنے لگتا ہے' پھر جب ہم اسے اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا فرما دیں تو کہنے لگتا ہے کہ اسے تو میں محض اپنے علم کی وجہ سے دیا گیا ہوں' بلکہ یہ آزمائش ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ بے علم ہیں۔

جب انسان اپنی غلط کاریوں کے نتیجے میں کسی مشکل میں گرفتار ہوتا ہے تو وہ اللہ کو یاد کرتا ہے لیکن جب نعمتیں میسر ہوتی ہیں تو وہ انہیں اپنے علم وہنر کا باعث قرار دیتا ہے۔وہ یہ بھول جاتا ہے کہ ہر شے اللہ کی پیدا کردہ ہے اور انسانوں کو جو کچھ مل رہا ہے وہ سب اس زمین سے نکلتا ہے۔علم وہنر بھی اللہ ہی کا عطا کردہ ہے انہیں صلاحیتوں کی بنا پر انسان صرف محنت کرتا ہے۔شاطر لوگ تو محنت بھی نہیں کرتے بلکہ ان صلاحیتوں کا غلط استعمال کرتے ہوئے دوسروں کی محنت

کا ماحصل لوٹ لیتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُجَادِلُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِ اللّٰہِ بِغَیۡرِ سُلۡطٰنٍ اَتٰىہُمۡ اِنۡ فِیۡ صُدُوۡرِہِمۡ اِلَّا کِبۡرٌ مَّا ہُمۡ بِبَالِغِیۡہِ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ (40:56)۔

جولوگ باوجود اپنے پاس کسی سند کے نہ ہونے کے آیات الٰہی میں جھگڑا کرتے ہیں ان کے دلوں میں بجز نری بڑائی کے اور کچھ نہیں وہ اس تک پہنچنے والے ہی نہیں، سوتو اللہ کی پناہ مانگتا رہ بیشک وہ پورا سننے والا اور سب سے زیادہ دیکھنے والا ہے۔

جولوگ اللہ کی آیات کے بارے میں بحث مباحثہ کرتے ہیں جب کہ ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی اتھارٹی نہیں ہوتی وہ دراصل تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں موجود مفتی، علامہ، شیخ اس آیت کی چلتی پھرتی تشریح ہیں۔ وہ خود کو حق پر اور اپنی بات کو حرف آخر سمجھتے ہیں۔ نہ معلوم ان کی نظر سے ایسی آیات گزرتی ہیں تو ان کا ردعمل کیا ہوگا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کا اپنا مکافات عمل کا نظام ہے جس کے دائرے سے کوئی بھی باہر نہیں نکل سکتا۔

وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا فِیۡۤ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَیۡہِ وَفِیۡۤ اٰذَانِنَا وَقۡرٌ وَّمِنۡۢ بَیۡنِنَا وَبَیۡنِکَ حِجَابٌ فَاعۡمَلۡ اِنَّنَا عٰمِلُوۡنَ (5-41)۔

اور انہوں نے کہا کہ تو جس کی طرف ہمیں بلا رہا ہے ہمارے دل تو اس سے پردے میں ہیں اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہم میں اور تجھ میں ایک حجاب ہے، اچھا تو اب اپنا کام کیے جا ہم بھی یقیناً کام کرنے والے ہیں۔

آج بھی جہاں کوئی قرآن کریم کی بات کرتا ہے اسے اسی طرح کی باتیں سننے کو ملتی ہیں کہنے کا انداز بدلتا رہتا ہے مفہوم یہی رہتا ہے کہ چھوڑو آپ کو کیا معلوم اسلام کے بارے میں۔ یہ کام تو علماء دین کا ہے۔ اور مذہب کے ٹھیکیداروں کا ردعمل بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَا تَسۡمَعُوۡا لِہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ وَالۡغَوۡا فِیۡہِ لَعَلَّکُمۡ تَغۡلِبُوۡنَ (41:26)۔

اور کافروں نے کہا اس قرآن کو سنو ہی مت (اس کے پڑھے جانے کے وقت) اور بیہودہ گوئی کیا کرو کیا عجب کہ تم غالب آجاؤ۔

کچھ یہی صورت حال آج بھی ہے۔ اگرچہ براہ راست نہیں لیکن بالواسطہ طور پر قرآن کریم سننے سے روکا جاتا ہے۔ یہ وہ سننا ہے جو سمجھنے کے لئے ہو۔ بلا سوچے سمجھے سننے کا تو بہت اہتمام کیا جاتا ہے۔ حسن قرات کے مقابلے کرائے جاتے ہیں، مدرسوں میں قرآن کریم حفظ کرایا جاتا ہے اور تجوید سکھائی جاتی ہے۔ جن لوگوں نے مذہب پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے اور وہ عام آدمی کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ خود

قرآن کریم کو پڑھے اور اس پر غور کرے۔ وہ یہ کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے کہ ایسا کرنے سے انسان گمراہ ہو جاتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (43:23)۔

اسی طرح آپ سے پہلے بھی ہم نے جس بستی میں کوئی ڈرانے والا بھیجا وہاں کے آسودہ حال لوگوں نے یہی جواب دیا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا اور ہم تو انہی کے نقش پا کی پیروی کرنے والے ہیں۔

اس مقام پر بھی مخالفت کرنے والوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ آسودحال ہوتے ہیں اور دلیل وہی کہ ہم تو اپنے باپ دادا کے نقش قدم پر چلیں گے۔ آج بھی جب قرآن کریم کی بات کی جائے تو مذہب پرست طبقہ اسی بات پر لوگوں کے جذبات کو مشتعل کرتا ہے کہ دیکھو یہ شخص ان بزرگوں اور عظیم ہستیوں کو غلط کہہ رہا ہے۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (45:23)۔

کیا آپ نے اسے بھی دیکھا ؟ جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور باوجود سمجھ بوجھ کے اللہ نے اسے گمراہ کر دیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر بھی پردہ ڈال دیا ہے، اب ایسے شخص کو اللہ کے بعد کون ہدایت دے سکتا ہے۔

یہ ایک اور عظیم حقیقت بیان کی گئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انسان اپنی خواہشات کو الٰہ کا درجہ دے دیتا ہے۔ ایسا کرنے سے وہ جانتے بوجھتے گمراہ ہو جاتا ہے، اس کی سماعت اور قلب پر مہر لگ جاتی ہے، آنکھوں پر پردہ آجاتا ہے اس کے بعد اسے کون ہدایت دے سکتا ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ وہ کن لوگوں کو ہدایت دیتا ہے اور کون ہیں جو گمراہ ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ راستے کا انتخاب تو انسان ہی نے کرنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو اسی کے اختیار کردہ راستے کے مطابق وہاں پہنچا دیتا ہے۔ انسان ہدایت کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دے دیتا ہے اور اگر گمراہی کا راستہ اختیار کیا جائے تو گمراہی ملتی ہے۔ محض زبان سے ہدایت مانگنے سے اللہ ہدایت نہیں دیتا اس کے لئے قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھنا ضروری ہے۔ وہی ہدایت کا سرچشمہ ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ

اَعْمَالَھُمْ (47:9)۔

یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی نازل کردہ چیز سے ناخوش ہوئے' پس اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے۔

یہاں بھی قرآن کریم کو ناپسند کرنے والوں کی ذہنیت بتائی گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعمال رائیگاں چلے جاتے ہیں۔ لوگوں سے قرآن کریم کی باتیں بیان کی جائیں تو ان کا ردعمل ایسا ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بہت بری بات کہہ دی ہو۔ اللہ کا پیغام جس اللہ کے رسول کے ذریعے بھی پہنچا اس پر جس قسم کے ردعمل سامنے آئے وہ اللہ کے آخری پیغام قرآن کریم میں آ گئے ہیں۔ اس پیغام پر آج بھی اسی طرح کا ردعمل سامنے آ رہا ہے اور جو کچھ اسلام کے نام سے رائج ہے اس میں قرآن کریم کا حصہ بہت کم ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جو تجربے سے ثابت ہوسکتی ہے کہ انسان جن مشکلات کا شکار ہوتا ہے وہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے ان اصولوں کی خلاف ورزی کا جو قرآن کریم میں درج ہیں۔ اس کے برعکس ان اصولوں پر عمل کرنے سے انسان ہر قسم کی مشکلات سے بچ سکتا ہے۔ اگر ہم سب کا ان پر ایمان پختہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری زندگی خوشگوار نہ ہو۔ البتہ مشکل یہ پیش آتی ہے کہ جن اصولوں پر صرف مملکت ہی عمل پیرا ہوسکتی ہیں ایک فرد نہیں (مثال کے طور پر سیاسی اور معاشی پروگرام) ان سے متعلق امور میں دقت ہوتی ہے۔ لیکن جن اصولوں پر انفرادی طور پر عمل کیا جا سکتا ہے ان کی خلاف ورزی سے صرف اپنے آپ ہی کو نقصان ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تنویر مفتی، سویڈن

مُلّا ازم یا مولا ازم؟

پچھلے چند برسوں میں پاکستانی طلباء کی ایک کثیر تعداد یورپی ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آئی۔ میدانِ تحقیق اور ٹیکنالوجی میں یہ جوان اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ان ممالک کے تعلیمی ادارے بھی ان کی کارکردگی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ پروفیسر حضرات ان جوانوں کی صلاحیتوں کی تعریف کرتے ہیں۔ ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ میرا مشاہدہ ہے کہ ان جوانوں میں اسلام اور پاکستان کی محبت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔لیکن جو چیز زیادہ واضح نظر آتی ہے وہ ''ملائیت'' ہے' یعنی اسلام میں ''مُلّا ازم'' کی پیوندکاری کے رنگ زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

ان جوانوں میں زیادہ تر 70 اور 80 کی دہائی میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہی وہ دہائیاں تھیں خصوصاً 80 کی دہائی جس میں مُلّا ازم کا پرچار عروج پر رہا اور یہ نوجوان اس مُلّا ازم کے رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں جہاں امت مسلمہ کو انتہائی گھمبیر مسائل ومصائب سے گزرنا پڑ رہا ہے وہاں بحث و مباحثہ کا موضوع ''حلال اور حرام'' زیادہ اہمیت لیتا نظر آتا ہے۔اسلام انسانی زندگی کو آسان بنانے آیا تھا اور بناتا بھی ہے۔لیکن مُلّا ازم کا سرایت کر جانا بہت سوں کی زندگی کو اجیرن بنائے ہوئے ہے۔ہمیں کیا کھانا چاہئے اور کیا نہیں۔ یہ سوال یہاں دیارِ غیر میں بہت اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔جبکہ میرا سوال ہے کہ ہم پاکستان میں ہر چیز کھانے سے پہلے کیوں نہیں چیک کرتے کہ آیا وہ حلال ہے یا حرام؟ اس میں جتنا دھوکہ پاکستان میں ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے وہ ان ممالک میں نہیں۔ کیونکہ قانون کے مطابق ہر کھانے پینے والی شئے کے اندر جو کچھ استعمال ہوتا ہے وہ اس کی پیکنگ پر درج کرنا لازم ہے۔

اسلام کے اجتماعی قوانین کو توڑنے سے پورے معاشرہ پر ضرب پڑتی ہے اور اس کے نقصانات اجتماعی طور پر سب کو بھگتنے پڑتے ہیں اور ہم بھگت رہے ہیں۔ بحث و مباحثہ اسلام کے اجتماعی قوانین پر ناپید ہے اور یہی مُلّا ازم کی تعلیمات ہیں کہ اللہ کو خوش کرو اور جنت میں اپنی سیٹ بک کروالو۔ چاہے اس کے بدلے اپنی اور اجتماعی زندگی جہنم بنی ہو۔

ذرا چند ایک اجتماعی قوانین پر غور کریں۔ کیا وقت پر نہ آنا حلال ہے؟ کیا کسی سے کیا ہوا وعدہ پورا نہ کرنا

حرام نہیں؟ کیا حرام طریقے سے کمائی دولت سے حلال گوشت کھانا حلال ہے؟ کیا بے ایمانی سے کسی بھی امتحان میں کامیاب ہونا حرام نہیں؟ کیا 6 گھنٹے کام کے بعد 8 گھنٹے کی اجرت حلال ہے؟ اور وہ حضرات جو سالہا سال غیر ممالک میں نوکریاں کر رہے ہیں لیکن حکومت پاکستان سے بھی تنخواہ لیتے چلے جا رہے ہیں اور وہ جو اپنے لواحقین کی وفات کے باوجود ان کی پینشن اب تک لئے چلے جا رہے ہیں۔

ملائیت کا رنگ اس نوجوان نسل میں پھر یوں بھی واضح نظر آتا ہے جب اکثر یہ جوان ہر وہ بات جو ملائیت سے مختلف لگتی ہے اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں۔ یعنی دروازہ مکمل طور پر بند کیا جا چکا ہے۔ جب مکان میں پہلے ہی کوئی اور بستا ہو تو کوئی نیا کیسے اندر آ سکتا ہے۔ ملائیت کی پیوند کاری اتنی مضبوط کی گئی ہے کہ اکثر جوان اس کو دوسری بار سوچنے کے لئے تیار ہی نہیں۔ دیوانگی کی حد تک جذباتی وابستگی عقل کو ماؤف کر دیتی ہے۔ جذباتی وابستگی اگر عقل کے تابع رہے تو ایک بے پناہ قوت ہے' لیکن اگر جذبات عقل پر حاوی آ جائیں تو جنون اور شدت پسندی جنم لیتی ہے' شاید وطنِ عزیز کچھ ایسے ہی حالات کی غمازی کر رہے ہیں؟

دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ان جوانوں میں اکثریت ملا ازم اور ملائیت کے خلاف ہے۔ شاید مُلّا ازم کی یہی سب سے بڑی کامیابی ہے کہ میں جس کے خلاف ہوں وہی میرے اندر موجود ہے۔ یہ کیسے اور کب میرے اندر سرائیت کر گیا؟ یہ میرے اندر گھر بنانے میں کیسے کامیاب ہو گیا؟

جب ہم اپنی آنے والی نسلوں کو خود تیار نہ کریں گے تو یہ کام کوئی اور کرے گا۔ اور وہ ''کوئی اور'' ان نسلوں کو اس طرح تیار کرے گا جیسے وہ چاہتا ہے۔ ایسے نہیں جیسے ہم خود چاہتے ہیں۔ ہماری اپنی چاہت اس وقت سامنے آتی ہے جب یہ کام پہلے کوئی اور کر چکا ہوتا ہے۔ بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ کیا واقعی دیر ہو چکی ہے؟

متلاشی رہنا شاید بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ جو میں نے پا لیا وہ درست اور حقیقت ہے۔ تھوڑی سی پیاس پانی کی تلاش کا سبب بنتی رہتی ہے وگرنہ جمود طاری ہو جاتا ہے۔ جمود ٹھہراؤ پیدا کر دیتا ہے اور ٹھہراؤ شاید موت کا دوسرا نام ہے؟

اب تضاد یوں دیکھئے کہ جب یوں روزمرہ زندگی کے مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھنا ہو تو یہ جوانانِ اسلام اپنی سوچ' جو کہ اپنی نہیں ہوتی' بیان کرنے کے بعد ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ: ''میں مذہبی عالم نہیں ہوں' لہٰذا کسی عالم سے رابطہ کرنا چاہئے۔'' یہاں پھر اندر کا مُلّا بول اٹھتا ہے 'دینی عالم' کی تعریف یا اس کا ذکر سارے قرآن میں نہیں ملتا۔ اب اس پر استفسار کیا جائے تو کہا جاتا ہے کہ ''ہم مُلّا کی نہیں دینی عالم کی بات کرتے ہیں۔ اب مُلّا اور دینی

عالم کے درمیان تفریق کی لکیر کیسے لگے گی اور وہ کون لگائے گا؟

مولا میرے اندر میرے خون اور میری رگ و پے میں موجود ہے' جبکہ ''مولانا'' میرے اندر باہر سے داخل کیا گیا۔ اس نے میرے اندر توڑ پھوڑ برپا کر دی۔ میرے اندر کو ٹکڑے کر دیا۔ مجھے تقسیم کر دیا۔ کبھی میرا ایک بٹا ہوا حصہ سامنے آتا ہے تو کبھی دوسرا۔ مجھے اپنی یکسانیت و موحدیت ڈھونڈے نہیں ملتی۔ مجھے الجھا دیا گیا۔

اسلام تو ہر انسان لے کر پیدا ہوتا ہے' ہر انسان پیدائشی مسلماں پیدا ہوتا ہے۔ اس کو اس سے ہٹانا اور توڑنے کا عمل باہر سے شروع ہوتا ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال لیجئے۔

ایک باپ گھر پہنچتا ہے تو اسے بتایا جاتا ہے کہ ایک خوبصورت گلاس ٹوٹا ہے۔ وہ اپنے 2 سالہ بیٹے سے پوچھتا ہے کہ گلاس کس نے توڑا؟ دو سالہ بیٹا بلا دھڑک چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے' ''میں نے توڑا ہے'' دوسرے ہی لمحے اس کے منہ پر ایک طمانچہ پڑتا ہے۔ سوچئے اس 2 سالہ بچے کو علم ہی نہیں کہ جھوٹ کیا ہوتا ہے۔ لیکن سچ اور سچ بولنا وہ لے کر پیدا ہوا ہے۔ لیکن وہ طمانچہ جھوٹ کی بنیاد ڈال دیتا ہے۔ ''اگر میں یہ نہ مانتا کہ میں نے یہ گلاس توڑا ہے تو اس طمانچے کی تکلیف سے بچ جاتا''۔ کیا جھوٹ' مکر' فریب' دھوکہ ہم خود اپنے بچوں اور جوانوں کو نہیں سکھاتے؟ یہ خامیاں و برائیاں ساتھ لے کر پیدا نہیں ہوتے۔ لے کر صرف اسلام اور اسلامی قدریں پیدا ہوتے ہیں۔ خرافات باہر سے ڈالی جاتی ہیں۔ کیا آپ نے چھوٹے بچوں میں رنگ' نسل' مذہب وغیرہ کی تفریق کرتے دیکھا ہے؟ کیا بچوں کو علم ہے کہ وہ شیعہ' سنی' پنجابی' سندھی' کالے' گورے' خوبصورت یا بدصورت ہیں؟ یہ پیمانے اور تفریق ہم خود سکھاتے ہیں۔ بات گھر میں والدین سے شروع ہوتی ہے اور پھر سکول و مسجد کی تفریقی تعلیمات اندر کی دنیا میں عذاب برپا کر دیتی ہیں۔ ایک خودکش شاید اسی توڑ پھوڑ کا نتیجہ ہے کہ اس کی اندر کی دنیا کے حصے بخرے اس کے جسم کے حصوں بخروں میں نظر آجاتے ہیں۔ یہ Self Destruction کو اپنے آپ تک نہیں رکھتے بلکہ اسے ایک معاشرے کی تباہی تک پھیلانے پر تیار ہوتے ہیں۔ شاید اسی باہر سے اندر ڈالی گئی خرافات کا نام 'ملا ازم' ہے' جو آہستہ آہستہ میرے اندر مولا کو کسی کونے میں سلانے میں مشغول رہتا ہے اور بہت دفعہ اس میں کامیاب بھی رہتا ہے۔

حلال و حرام کی طرف لوٹتے ہوئے' اسلامی تاریخ میں شواہد ملتے ہیں کہ بسا اوقات شخصی یا اجتماعی طور پر کسی عمل یا شے کو وقتی طور پر ''حلال'' یا ''حرام'' قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ذیابیطس کے مریض کو 'میٹھا' اپنے اوپر حرام کرنے کی ضرورت ہے اور ایسی دوا کو ''حلال'' طور پر

استعمال کرنا ہوگا چاہے وہ دوا کچھ 'حرام' اجزا سے بنائی گئی ہو۔ یوں بلڈ پریشر کے بھاری بھرکم مریضوں کو گوشت اور انڈا وغیرہ اپنے اوپر ''حرام'' کرنا ہوگا۔ چاہے گوشت اور وہ کمائی جس سے گوشت خریدا جا سکتا ہو حلال ہی ہوں۔ اجتماعی طور پر ایک معاشرہ' ملک یا قوم مثلاً دشمن کی بنائی ہوئی اشیاء کو اپنے اوپر ''حرام'' کر سکتا ہے۔ مثلاً میرا یہ سوال ہے کہ امت مسلمہ امریکی و یہودی اشیاء کو وقتی طور پر ممنوع کیوں نہیں کر لیتے؟ بظاہر چھوٹے پیمانے پر ایسا 'حرام' بڑے نتائج کا حامل ہوسکتا ہے۔ مثلاً ہم کیوں نہ کوکا کولا یا اور میکڈانلڈ (McDonald) کو ممنوع قرار دے لیں؟ انٹرنیٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق کوکا کولا ہر روز صرف مسلمان ملکوں سے 86 ملین ڈالر کماتا ہے اب ایک طرف تو میں امریکی و یہودی کو برا بھلا کہتا ہوں کہ دنیا میں ہر طرف میرے مسلمان بھائیوں کو مارا جا رہا ہے اور دوسری طرف میں انہیں خود کوکا کولا اور میکڈانلڈ کی شکل میں اپنی دولت سے مضبوط کر رہا ہوں۔ تیل کی دولت سے خریدی ہوئی مغربی اشیاء ''حلال'' کیسے ہوسکتی ہیں جبکہ دوسری طرف ہم مغرب والوں کو ہی موردِ الزام ٹھہراتے ہیں؟ کہیں تو تضاد ہے؟ لہٰذا ''حلال و حرام'' جائز و ناجائز اور روا ناروا کا مسئلہ اگر فکری انداز سے تولا جائے تو اس کے بہت دوررس نتائج شخصی اور اجتماعی طور پر نکل سکتے ہیں۔ لیکن مُلّا ازم کی سطحی سوچ فکر میں روڑے اٹکاتی ہے۔ یہ جوانانِ اسلام جو صلاحیتوں سے مالا مال ہیں ''گناہ'' کے خوف سے اپنی کچھ صلاحیتوں کو پنپنے سے محروم کر دیتے ہیں اور یہ خوف اندر بیٹھے مُلّا کا ڈالا ہوا ہے' مولا کا نہیں۔ مُلّا ازم کو جڑ پکڑنے میں کئی صدیوں کا عرصہ لگا۔ اب اس جڑ کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے ایک طویل جہاد کی ضرورت ہوگی۔ یہ جہاد شخصی بھی ہو' یعنی میرے اندر اور اجتماعی بھی۔ اس میں والدین سکول اور اساتذہ کا رول سب سے اہم ہے۔ مسجد میں بیٹھے ہوئے کو بھی مولانا یا ''دینی عالم'' نہیں استاد ہونا پڑے گا۔ جو ''مولا ازم'' کی تعلیمات دے۔ 'مولا ازم' کی تعلیم یکساں اور ساری انسانیت کے لئے ایک ہی ہے۔ مُلّا ازم کی معلومات ہزاروں ہیں۔ بکھری ہوئی ہیں ایک کی بات دوسرے سے نہیں ملتی اور یہی کچھ آگے ان جوانوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ غور کیجئے دین تو ایک ہے لیکن ایک ہی دین کی لاتعداد ''دینی جماعتیں'' یہ کیا بوالعجبی ہے؟ ہر جماعت کا اپنا ایک منشور ہوگا جو دوسری جماعت سے نہیں ملتا بلکہ دوسری جماعتوں کے منشور کی نفی کرتا نظر آئے گا۔ ایسے دور میں پلی ہوئی نوجوان نسل تذبذب کا شکار ہی نظر آ سکتی ہے۔ باہر سے داخل کیا ہوا بیسیوں قسم کا مُلّا ازم پیدائشی مولا ازم پر حاوی نظر آتا ہے۔ یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ النوح

(آیات 1 تا اختتام)

عزیزانِ من ! آج دسمبر 1983ء کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ نوح سے ہو رہا ہے:(71:1)

عذاب یا تباہی

جیسا کہ میں ہر بار اس کی یاد دہانی کراتا ہوں کہ ان آخری پاروں میں بالخصوص اس تباہی کا ذکر آ رہا ہے جو نبی اکرم ﷺ کی دعوت کے مخالفین کی طرف سے مسلسل تیئیس سال اور بالخصوص آخری سات آٹھ سال میں ابھر کر سامنے آتی رہی۔قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ ان تباہیوں کو' جو قوموں پر آتی ہیں' یا تو خارجی حوادث کے تشبیہات کے رنگ میں پیش کرتا ہے یا اس قوم کے اندر جو خلفشار پیدا ہوتا ہے' وہ اس انداز میں پیش کرتا ہے۔اسے عذاب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اصل میں ہم جو مذہب کے خوگر ہو گئے ہیں تو جب عذاب یا عذابِ خداوندی کے الفاظ سنتے ہیں تو ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ آسمان سے کسی قسم کی بلائیں اترتی ہیں اور اس طرح سے اس قوم کو مصیبت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔عذاب کے معنی قوم کی تباہی کیجیے' بات صاف ہو جاتی ہے۔

قرآنِ کریم کا انداز

قرآنِ کریم اقوامِ سابقہ کی تاریخ اور ان کی داستانیں بیان کرتا ہے۔وہ تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔اس کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک دعویٰ کرتا ہے۔دعویٰ یہ ہے کہ غلط خطوط پر متشکل نظام بالآخر تباہ ہو کر رہتا ہے۔قوم کی تباہی کی شکل ایک تو یہ ہوتی ہے کہ وہیں اپنے ہی ملک کے اندر باہمی فساد انگیزیوں' خوں ریزیوں کے ہاتھوں ہی وہ ختم ہو جائے یا کوئی دوسری قوم اس قوم کی جگہ لے لے۔دعویٰ وہ یہ کرتا ہے اور اس دعوے کے ثبوت میں پہلے وہ دلائل پیش کرتا ہے۔خالص علمی سطح پہ گفتگو

کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ یہ بتاتا ہے کہ تاریخ کے اوراق سے اس کی شہادت پوچھیے کہ جس قوم نے اس قسم کا غلط نظام قائم کیا' اس کا انجام کیا ہوا۔ وہ اس کے لیے شہادات میں عام طور پہ وہ قومیں پیش کرتا ہے جن سے قرآنِ کریم کی اولیں مخاطب قوم یعنی قریش یا حجاز کے عرب پہلے سے ہی مانوس اور متعارف تھے۔ وہ ان قوموں کی تاریخ کو جانتے تھے۔ اس کے انجام سے واقف تھے۔ ان کی اجڑی ہوئی بستیوں سے صبح شام گزرتے تھے۔ آپس میں باتیں کرتے رہتے تھے۔ چرچا ہوتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ یہی سمجھتے تھے کہ آسمان سے کوئی بجلی گری اور یہ سب تباہ ہوگئیں۔

قوموں کی تباہی کی بنیادی وجوہات

قرآن اس کے مقابلے میں بتاتا یہ ہے کہ تباہی کے نشانات تو تم دیکھتے ہو' اس کی وجہ کی طرف تم توجہ نہیں دیتے۔ وہ وجہ یہ تھی کہ اس قوم کے اندر نظام غلط تھا' جرائم عام ہوگئے تھے' اور اس وجہ سے وہ قوم تباہ ہوگئی تھی۔ اور وہ اس کے بعد کہتا یہ ہے کہ اگر تمہارا نظام بھی اسی قسم کی غلط بنیادوں پر استوار ہے' اگر تم اس سے باز نہ آئے' تو تمہارا انجام بھی وہی ہوگا جو اقوامِ سابقہ کا ہوا ہے۔ یہ ہے اقوامِ سابقہ یا انبیاء گزشتہ کی داستانیں بیان کرنے کا مقصد۔ اقوامِ سابقہ میں خرابیاں تو بہت عام ہوتی تھیں لیکن قرآن ان میں سے اس خرابی کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے' جو ان کو لے ڈوبنے والی ہوتی ہے۔ وہ خرابی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ لہٰذا قرآن خاص طور پہ اس خرابی کا ذکر کرتا ہے' اور شروع کرتا ہے' داستانِ حضرتِ نوحؑ سے۔ اب آپ دیکھیے کہ وہ جو قوموں کی تباہی کے یا عذاب کے جرائم یا اسباب گناتا ہے' ان میں کس کس قسم کی چیزیں آتی ہیں۔ خصوصی طور پر حضرتِ نوحؑ کی قوم کا جرم گناتا ہے کہ اس میں طبقاتی تفریق بہت زیادہ تھی۔ جسے Class Discriminaion (نسلی امتیاز) کہتے ہیں۔ وہ کام کاج کرنے والے' کمی کمین کا طبقہ تھا' انہی کے ہاں بڑے بڑے مترفین' سردارانِ قوم' بڑے بڑے جاگیردار' بڑے بڑے زمیندار کا طبقہ تھا۔ انہوں نے اپنے ہی ہاں کام کرنے والے جنہیں وہ کامی' کمی' کمین' سمجھتے تھے' رکھے ہوئے تھے۔ اس قوم کے ڈوبنے کا' اس قوم کی تباہی کا' قرآن نے جرم ہی یہ بیان کیا ہے کہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہاں طبقاتی تفریق شدت تک پہنچی ہوئی تھی۔ اب دیکھتے چلے جایئے کہ یہی جرائم جب ہمارے زمانے میں آئیں گے تو قومیں انہی کے ہاتھوں سے تباہ ہوئی ہیں۔

قریش کے ہاں بھی یہ نسلی امتیاز بڑی چیز تھی۔ نسلی امتیاز کی بناء پر ان کے ہاں برہمن اور شودر کی کیفیت پیدا ہوچکی تھی۔ بہرحال وہ حضرتِ نوحؑ سے ابتداء کرتا ہے۔ اس قوم کے اندر طبقاتی تفریق تھی جس کی وجہ سے وہ تباہ ہوئی۔

قومِ عاد کا جرم

اس کے بعد وہ قومِ عاد کو لیتا ہے تو کہتا یہ ہے کہ ان کے ہاں کے اربابِ اقتدار کی حکومت ڈنڈے کے زور پر تھی۔ تکبر تھا' استکبار تھا' استحصال تھا' سرکشی تھی۔ کوئی قانون نہیں تھا۔ اگر تھا تو وہ صرف جنگل کا قانون تھا۔ اس میں استکبار اور استحصال والی بات تھی۔ یہ بات قرآن نے کہی ہے لیکن قومِ عاد کے قصے میں قرآن ایک ایسا نکتہ بیان کر گیا ہے جس کی تفسیر تو شاید میں کبھی بعد میں بیان کرونگا مگر وہ ہے بڑی اہم چیز۔ وہ چیز یہ ہے کہ وہ جو اربابِ اقتدار تھے' انکا تو یہ بتایا کہ وہ اس قسم کے استحصال اور استکبار' اور اس قسم کی سرکشی سے حکومت کرتے تھے جب کہ قوم کا جرم یہ بتایا کہ وہ خاموشی سے ان کی ان تمام چیزوں کو برداشت کیے چلی جاتی تھی۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ کبھی میں بیان کرونگا وہ مکالمہ جو قرآن دوزخ میں' جہنم میں' ان نیچے کی قوم اور اس قوم کے اکابرین کے مابین بتاتا ہے۔ قوم خدا سے یہ کہتی ہے کہ انہیں دہرا عذاب دیجیے: ایک ان کے اپنے جرم کی وجہ سے' اور دوسرا اس وجہ سے کہ ہمیں بھی انہوں نے گمراہ کیا۔ جواب ملتا ہے کہ تمہیں بھی دہرا عذاب ہوگا کیونکہ ان کی قوت تو تمہارے ہی دست و بازو کی رہینِ منت تھی۔ یہ قوت کہاں سے لائے تھے۔ تم نے انہیں خدا بنایا تو یہ خدا بن بیٹھے' ورنہ ان کی تو اپنی حیثیت ہی کچھ نہیں تھی۔ عزیزانِ من! اس جرم کی پاداش میں قوم تباہ ہوتی ہے۔

قومِ ثمود کا جرم

آگے قومِ ثمود آتی ہے۔ ان کے ہاں کی معیشت Agriculture (زراعت) تھی' زرعی معیشت تھی۔ وہ عام طور پہ مویشی پالتے تھے۔ بڑے بڑے سرداروں نے چشموں اور چراگاہوں پہ قبضہ کر رکھا تھا۔ خدا کے ان ذرائع رزق کو ذاتی ملکیت بنا رکھا تھا اور غریبوں کے مویشیوں کو وہ آگے آنے ہی نہیں دیتے تھے۔ جب کبھی وہ چھوڑ کر چلے گئے تو بقایا پانی' تھوڑا بہت گھاس بچ رہا' تو وہ ان کے حصے میں آ گیا ورنہ انہوں نے زمین اور ذرائع پر ذاتی قبضہ کر رکھا تھا۔ ذرائع پیداوار کو استحصال کے طور پہ اپنے قبضے میں لینا قومِ ثمود کا جرم بتایا گیا۔

قومِ مدین کا جرم

قرآنِ کریم شعیبؑ کے سلسلے میں قومِ شعیب یا قومِ مدین کا ذکر کرتا ہے۔ ان کے ہاں معیشت کاروباری تھی۔ یہ کہا کہ وہ کاروبار میں ڈنڈی مارتے تھے۔ کبھی پورا تول نہیں دیتے تھے۔ اکانومی (معیشت) اس قسم کی رکھی ہوئی تھی۔ بات آج بھی وہی ہے' انداز کچھ ایسے بدلے ہوئے ہیں کہ اس کے لیے اصطلاحات' (Terms)' کچھ بدل گئی ہیں' بات ڈنڈی

مارنے کی ہے جو قرآن کہتا ہے۔ یہ ہے جرم قومِ شعیبؑ کا جس کے ہاتھوں وہ تباہ ہوئی ہے۔

فرعون کا جرم اور دیگر جرائم

اس کے بعد فرعون [1] آتا ہے۔ اس کا جرم کیا ہے؟ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی [2] (79:24)۔

اس نے رزق کی ساری چیزیں اپنے کنٹرول میں رکھی ہوئی تھیں' جسے جتنا چاہے' اتنے کی پرچی اس کو دیدے۔ یہ جرم ہے فرعون کا۔ یہ اس قسم کے وہ موٹے موٹے جرائم ہیں جن کی وجہ سے قومیں تباہ ہوتی ہیں۔ قرآن بار بار ان کا ذکر کرتا چلا آتا ہے۔ حضرتِ عیسیٰؑ کے زمانے میں یہودیوں کے مذہبی پیشوا کی تھیوکریسی کو وہ اس قوم کی تباہی کا موجب بتا رہا ہے۔ تھیوکریٹک سسٹم (مذہبی پیشوائیت) میں آخری اقتدار یا اتھارٹی مذہبی پیشواؤں کی ہوتی ہے کہ شریعت میں یہ کہا ہے' وہاں یوں آیا ہے اور اس کے بعد کوئی ان کے خلاف کچھ نہیں کہتا تھا۔ سب بے دست و پا ہوتے ہیں۔ حضرتِ عیسیٰؑ کے زمانے میں یہودیوں کا یہ جرم گنایا ہے اور اس کے بعد ان کی تباہی کی داستان بتائی ہے۔ یہ ہیں وہ اسبابِ تباہی' اسبابِ عذاب جو قرآن بتاتا چلا آرہا ہے۔ وہ قریش کو بار بار کہتا ہے کہ ان اسباب و عمل میں سے تم خود دیکھ لو کہ تمہارے معاشرے میں کون کون سے جرائم پھل رہے ہیں اور پھر وہ پوچھتا ہے کہ بتاؤ! کیا تم بچ جاؤ گے؟

قوموں کی تباہی کی وجوہات

اب قریش سے آگے بڑھ کر آج کے دَور کے اندر آجایئے کہ جس نظام کی بنیاد بھی ان جرائم میں سے کسی ایک جرم پہ بھی ہوگی اور آپ جانتے ہیں کہ آج تو ایک ایک قوم میں ان اسباب و علل میں سے کتنی ہی چیزیں پائی جاتی ہیں' وہ قوم بچ نہیں سکتی۔ یہ تاریخی داستانیں نہیں ہیں' یہ زندگی اور موت کے وہ اصول ہیں جو ہمیشہ تک زندہ و پائندہ رہیں گے۔ ہر دَور میں جو بھی نظام ایسا ہوگا' جن میں ان میں سے کوئی جرم ہوگا' وہ تباہ ہو کے رہے گا' جو اصلاح کرلیں گے انہیں زندگی حاصل ہوگی۔ یہ ہے ماحصل قرآنِ کریم کی ساری تعلیم کا' عزیزانِ من! اور اس کے بعد کہا کہ اپنے نظام کو' اپنے معاشرے کو' دیکھو پھر اس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھو کہ ان میں کوئی جرم تمہارے ہاں تو نہیں پایا جاتا۔ اگر پایا جاتا ہے اور تم اس کی اصلاح کی فکر نہیں کرتے

---

[1] فرعون کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرنگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' ص ۔109' فٹ نوٹ نمبر 1۔

[2] تمہارا سب سے بڑا رب میں ہوں۔ (میں ہی تمہارا ''ان داتا'' ہوں) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

تو تباہ ہو جاؤ گے۔ خدا کا قانونِ مکافات تو اٹل ہے' اس کے نتائج برآمد ہو کر رہتے ہیں۔ یہ ہے مقصد' عزیزانِ من! ان کہانیوں کا' ان داستانوں کا' جو اقوامِ سابقہ کی بیان کی گئی ہیں۔

قوموں کے جرائم اور تذکرہ حضرت نوح علیہ السلام کا

عزیزانِ من! پچھلی دو تین سورتوں کے اندر بار بار قریش کی توجہ اس چیز کی طرف دلائی گئی ہے کہ تمہارا یہ نظام کہ جس میں نسبی تفاوت بھی ہے' طبقاتی امتیازات بھی ہیں' سودی کاروبار بھی تم کرتے ہو' مذہبی پیشوائیت بھی تمہارے ہاں اتنے زوروں کی ہے' یہ بچ نہیں سکتا۔ ان کے ہاں یہ جرائم اتنے اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس کے بعد قرآن اپنے انداز کے مطابق' تاریخی شہادت پہ آیا' اور اس نے بات شروع کی۔ وہ سب سے پہلے سلسلہ وحی کی ابتداء حضرتِ نوحؑ سے کرتا ہے۔ اس نے اس قوم کا ذکر کیا اور پوری سورۃ میں اس کے متعلق کہا۔ اس میں خاص طور پہ جرائم نہیں گنائے گئے کیونکہ وہ متعدد مقامات پر گنائے گئے ہیں۔

قرآن حکیم کا انداز

آپ قرآن کا انداز دیکھیے۔ یہ لوگوں کے ذہن میں نہیں آتا کہ بار بار کتنے مقامات پر قرآن انہی قصوں کو کیوں دہراتا چلا جاتا ہے۔ یاد رکھیے کہ یہ قرآن کوئی بیٹھ کر لکھی ہوئی کتاب نہیں ہے کہ اس کے ہاں اس Chapter (باب) میں یہ لکھنا ہے' اگلے Chapter (باب) میں یہ لکھنا ہے۔ اور اس کے بعد یہ تئیس سالہ حضورﷺ کی دورِ نبوت کی زندگی ہے جو مختلف مقامات' پر مختلف تقاریب پر ہے جس میں مختلف لوگ مخاطب تھے' یہ Chapter (باب) ان کے حسبِ حال ہے۔ یہ ایسا کچھ ابواب (Chapters) کی صورت میں نہیں ہے۔ اسے تو بس یوں کہیے کہ جیسے کچھ خطابات یا ایڈریسز (Addresses۔ خطبات) ہیں' ان کو مخاطب کر کے یہ چیزیں کہی گئی ہیں۔ تو جو چیز تئیس سال میں مختلف مقامات پہ کہی جائے گی' اس میں' جسے آپ تکرار کہتے ہیں' وہ تو دہرایا جائے گا لیکن وہ تکرار بھی ایسی نہیں ہے کہ من وعن اسی شکل میں وہ بیان کی جائے۔ ہر بار جو قصہ کسی قوم کا' یا کسی نبی کا' آئے گا اس میں کوئی نہ کوئی نکتہ ایسا آئے گا جو وہاں وجہ بصیرت ہو گا۔

اربابِ تنذیر

عزیزانِ من! اب یہاں حضرتِ نوحؑ کی داستان آ رہی ہے۔ کہا کہ اِنَّـآ اَرۡسَـلۡـنَـا نُـوۡحًـا اِلٰی قَوۡمِـهٖۤ اَنۡ اَنۡذِرۡ

قَوْمَکَ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ [1] (71:1)۔قرآن نے یہ واضح طور پہ کہا ہے کہ جب بھی کسی قوم کی حالت یوں بگڑتی تو پہلے وہاں وہ آتے جوان کو وارن کرتے' تنبیہہ کرتے کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ تباہی ہوگا۔اب بھی اصلاح کرلوتو بچ جاؤ گے۔اسے قرآن نے خدا کے قانونِ مکافات میں مہلت کا قانون کہا ہے کہ ایک غلط کار معاشرے کی تباہی میں اس قسم کا وقت ہوتا ہے کہ اس میں اگر اصلاح کرلے تو بچ رہتا ہے۔اس وقت میں وہ وارن کرنے والا آتا ہے جس کو یوں کہا جائے۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد رسول یا نبی تو کوئی آئے گا نہیں' لیکن خدا کی کتاب محفوظ شکل کے اندر قیامت تک موجود ہے۔اس کی وارننگ (تنبیہ) یہ ہے کہ جوکوئی قوم سے قرآن کی بات کہے تو اس نے قرآنی تعلیمات کو پہچانے کا فریضہ امتی ہونے کی حیثیت سے ادا کیا۔قرآن نے جو کہا ہے اس کو پیش کیا گیا: اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَکَ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (71:1)۔اس سے کہا گیا کہ اس قوم کو آگاہ کردو کہ قبل اس کے کہ ان کے اوپر آخری تباہی آجائے۔اب بھی اگر تم اپنی اصلاح کرلو' اپنے معاشرے کے نظام میں تبدیلی پیدا کرلو تو بچ جاؤ گے ورنہ تباہ ہوگے۔اگلی ہی آیت میں کہا کہ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (71:2) کہا: اے میری قوم! میں تمہیں وارن (تنبیہ) کرنے آیا ہوں۔آگاہ کرتا ہوں اور مبہم الفاظ میں نہیں' یہ ایسی چیز نہیں کہ بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔ میں نہایت واضح الفاظ میں تمہیں بتانے کے لیے آیا ہوں کہ یہ ہے تمہارے نظام کی وہ غلط روش اور یہ ہوگا اس کا نتیجہ۔

عبادت سے مراد خدا کی محکومیت ہے

لہٰذا یہ کہنے کے لیے آیا ہوں کہ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ [2] (71:1)۔قرآن میں خاص طور پہ سورۃ ھود میں آپ دیکھیے کہ یہ جتنے انبیاء کرامؑ ہیں وہاں ان کا ایک ہی جگہ ذکر آیا ہے اور باقی مقامات میں بھی ہے۔سب سے پہلے وہ ایک ہی بات کہتے تھے کہ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ (11:50;61:84)۔ہمارے ہاں اس کا ترجمہ ہوگیا: خدا کی پرستش کرو۔خدا کی پرستش او رپوجا تو سب قومیں کرتی ہیں۔یہ جو عبادت عَبَدَ یَعْبُدُ کی بات ہے اگر اس کا صحیح مفہوم ہو تو ساری بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہاں کہا کہ محکومیت صرف خدا کی اختیار کرو۔کسی انسان کے بنائے ہوئے قانون کی نہیں۔ ہر نبی کی تعلیم کا نکتہ آغاز یہ ہے کہ

---

[1] ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف یہ کہہ کر بھیجا کہ وہ انہیں غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کردے' قبل اس کے کہ دردناک تباہی کا عذاب ان کے سر پر آ کھڑا ہو۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

[2] تم قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کرو۔ (ایضاً)

وہ اشخاص کی محکومیت کو بدترین جرم قرار دیتا ہے۔قرآن میں محکومیت کے لیے حکومت کا حق کسی انسان کو نہیں ہے۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔اس لیے ہر نبی یہ کہتا تھا کہ خدا کی محکومیت اختیار کرو۔آپ عبادت کا ترجمہ یہ کر دیجیے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔قرآنِ کریم کے مطابق کسی اور انسان کے بنائے ہوئے نظام کی' قانون کی' اطاعت ہی نہیں ہے۔اطاعت صرف خدا کی ہے۔

متقی کا مفہوم

عزیزانِ من!اس کے ساتھ ہی کہا کہ وَاتَّقُوْهُ (71:3)اس کے احکام کی پوری پوری نگہداشت کرو۔ اب اِس واتقوا کے لیے ہمارے ہاں ''متقی'' کا لفظ آیا اور متقی' پرہیزگار تو ہم عام بولتے ہی ہیں اور آپ کو پتہ ہی ہے کہ پھر متقی کا ہمارے ذہن کے اندر کیا تصور آتا ہے' متقی دراصل واتقوہ سے ہے۔متقی وہ ہے جو ان قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرنے سے جو تباہ کن انجام ہوتا ہے' اس سے خوف کھاتا ہے۔کہا کہ احساس پیدا کرو کہ اگر غلط روش پر قائم رہو گے تو تباہی آ جائے گی۔اس لیے ان قوانین کی نگہداشت کرو اور ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ وَاَطِيْعُوْنِ [1] (71:3)۔عزیزانِ من! یہاں قرآن دو الفاظ کے اندر پورا نظام دے گیا ہے: اُعْبُدُوا اللّٰهَ (71:3) تو خدا کی محکومیت ہے۔خدا تو ایک غیر محسوس ہی نہیں' انسانوں کے خیال و قیاس وہم و گمان سے بھی بالاتر ہے: سبحان الله تعالیٰ عما یصفون [2]۔نہ کبھی سامنے آئے' نہ کبھی کسی کے سامنے گفتگو کرے' نہ ہم اس کی بات سنیں۔تو سوال یہ ہے کہ اس کی محکومیت کیسے اختیار کی جائے۔ محکومیت تو اسی کے قوانین کی ہوئی۔لیکن ایک زندہ اتھارٹی ہوگی جو ان قوانین کو نافذ کرے گی۔تو یہ اس کی نافذ کرنے والی اتھارٹی ہے۔اعبدوا الله ..... اطیعون (71:3)اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ میری اطاعت کرو۔میں خدا کے احکام نافذ کرونگا۔اس لیے ان قوانین کی محکومیت کی عملی شکل یہ ہوگی کہ یہ جو محسوس اتھارٹی ہے' اس کی اطاعت کرو۔

عزیزانِ من! قرآنِ کریم دو الفاظ میں اپنا پورا نظام دے گیا ہے۔اتھارٹی صرف خدا کے قوانین کی اطاعت کراتی ہے۔لیکن خدا کے قوانین کی اطاعت Abstract (غیر محسوس' نظری) طور پہ نہیں ہوتی ہے' اپنے اپنے طور پہ بھی نہیں ہوتی

---

[1] (قوانین خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کرنے کا عملی طریق یہ ہے کہ) تم اس نظام کی اطاعت کرو جسے میں (نوح علیہ السلام) ان قوانین کے نفاذ کے لیے متشکل کر رہا ہوں۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

[2] یہ لوگ خدا کے متعلق جس قسم کا تصور رکھتے ہیں' وہ اس سے بہت بلند اور منزہ ہے۔ (ایضاً)

ہے' وہ ایک نظام کے تابع ہوتی ہے۔ اس نظام میں اس کے احکام کی آخری اتھارٹی ہوتی ہے۔ وہ خدا کے احکام کو نافذ کراتا ہے۔ اپنے احکام نہیں نافذ کراتا۔ یہاں کہا ہے کہ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ (71:3)۔ قرآن دو الفاظ کے اندر پورا نظام اسلامی دے گیا ہے۔

خدا کے قوانین کی حکمرانی' خدا کی حکمرانی

عزیزانِ من! یہ قرآن عجیب کتاب ہے' آدمی وجد میں آ جاتا ہے۔ کہا کہ اس کا یہ طریقہ ہے اگر اُعْبُدُوا اللّٰهَ نہیں ہے' محکومیت خدا کے قوانین کی نہیں ہے تو وہ نظام اسلامی نہیں ہے۔ اگر آدمی اپنے اپنے طور پہ سمجھتا ہے کہ جس طرح میرا جی چاہے گا میں اس کی اطاعت کرونگا تو وہ نظام اسلامی نہیں ہے۔ اس نظام میں جو اطاعت کرانے والا ہے اگر وہ بھی اپنی ذات کی اطاعت کراتا ہے' تو شرک ہوگیا۔ یہ نظامِ خداوندی نہیں ہے۔ خدا کے احکام کی اطاعت ایک مرکزی اتھارٹی کے تھرو Through (ذریعے) ہوگی۔ یہ اسلامی نظام یوں' زندہ اتھارٹی ہے' اس لیے اطاعت کرنے والوں کی طرف سے کہا گیا ہے کہ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (2:285) ہم نے بات سنی ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے۔ تو سنتا تو اسی کا ہے جو کوئی سنانے والا ہو۔ اگر خالی کتاب کی اطاعت ہی مقصود ہوتی' تو نہ اس نظام کی' نہ رسول کے بھیجنے کی' ضرورت تھی۔ کتاب کو کسی چٹان پہ لکھ دیتے' آسمان سے اتار دیتے' لکھی لکھائی آ جاتی مگر اس سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ نبی کا فریضہ خدا سے احکام پانا ہے' وحی کو حاصل کرنا ہے۔ یہ نبوت ہے۔ اس کے بعد فریضۂ رسالت ہے کہ اس نبوت کے مطابق' خدا کے احکام کے مطابق' عملاً ایک معاشرہ متشکل کیا جائے۔ اس طرح پہلے تو ایک امت بنائی جائے' انسان بنائے جائیں' پھر ایک معاشرہ یا ایک نظام متشکل کیا جائے۔ اس کے ذریعے خدا کے احکام کی اطاعت ہوگی۔ یہ ہے جسے آپ اسلامی نظام کہتے ہیں۔ اگر یہ اتھارٹی نہیں ہے' تو دین نہیں ہے' مذہب ہے۔ اگر یہ اتھارٹی صرف اپنے ہی قوانین یا احکام کی اطاعت کراتی ہے تو یہ دین نہیں' شرک ہے۔ احکامِ خداوندی کی اطاعت ایک زندہ اتھارٹی کی وساطت سے ہے جو وہ زندہ اتھارٹی اپنی حکومت نہیں قائم کرے گی' خدا کے احکام کو نافذ کرے گی۔ یہ ہے اُعْبُدُوا اللّٰهَ ..... وَ اَطِيْعُوْنَ (71:3) عزیزانِ من! بات میں سے بات آ جاتی ہے۔

رسول بحیثیت اتھارٹی

قرآن نے یہ کہا تھا کہ یہ رسول ہے' اس نے یہ نظام قائم کیا ہے' اس کی اطاعت کرو' یہ نہ سمجھو کہ پھر اس کے بعد یہ سلسلہ

ختم ہوگیا اورتم اپنے عہدِ جاہلیت کی طرف چلے جاؤ گے یعنی اسی پہلے نظام کی طرف۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ سلسلہ رسول اللہ ﷺ کے بعد تک تھا۔ جب تک یہ نظام آپ کے ہاں قائم رہا ہے' وہ کچھ وقت کے لیے بھی کیوں نہ رہا ہو' وہ اسلامی تھا اور جب اس کے بعد آپ کے ہاں ملوکیت آئی' احکامِ خداوندی کی اطاعت نہیں' بلکہ آپ کے ہاں اربابِ اقتدار کی اطاعت آ گئی تو اس کے بعد اسلام کا نظام ختم ہوگیا۔ خدا کی عبادت کا ترجمہ پرستش کیا گیا: وہ تو پڑھ لی نماز۔ محکومیت بادشاہ کی' خلیفہ کی' سلطان کی' اختیار کی گئی۔ اس زمانے میں ایک شخص کی ہوتی تھی' آج مغربی جمہوریت کی ہے' وہ کچھ اشخاص جمع ہو جاتے ہیں' بات انسانوں کی حکومت کی ہے۔ خدا نے کہا تھا: اُعْبُدُوا اللّٰہَ (71:3) تم قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرو: وَاَطِیْعُوْنِ (71:3) اس نظام کی اطاعت کرو جسے میں ان قوانین کے نفاذ کے لیے متشکل کر رہا ہوں۔ یَغْفِرْ لَکُمْ مِّنْ ذُنُوْبِکُمْ (71:4) وہ جو تمہاری چھوٹی موٹی لغزشیں ہو جاتی ہیں' ان کے جو نقصانات ہوتے ہیں اس اطاعت سے ان نقصانات کی تلافی ہو جائے گی' ان نقصانات سے تمہیں حفاظت مل جائے گی کیونکہ یہ خدا کا قانون ہے' اس کی رحمت ہے کہ وَ یُؤَخِّرْکُمْ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی (71:4) ذرا لغزش ہوئی تو وہ فوراً گرفت نہیں کر لیتا۔

مہلت کا موقع رحمتِ خداوندی ہے

عزیزانِ من! اس کو اصلاح کا موقع دیتا ہے' Respite (مہلت) دیتا ہے' ایک وقتِ معین کے لیے مہلت دیتا ہے' وہ اس کو Postpone (ملتوی) کر دیتا ہے۔ وہ یہ کچھ اس لیے کر دیتا ہے کہ اس دوران ان کو وارن کیا جائے' بار بار ان کی اصلاح کے لیے ان کو متنبہ کیا جائے۔ اس وقت مؤخر کرنے کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ یہ ایسے ہی نہیں ہے کہ وہ اس لیے مؤخر کر دیتا ہے کہ ''اچھا چل' آج تے سانوں ویل نہیں۔ پھر کسی ویلے پھڑاں گے تہانوں۔''[1] یہ بات نہیں ہے۔ اب یہ اس پہ بڑی رحمت ہے جو درمیان میں تاخیر ہوتی ہے اِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ لَوْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ[2] (71:4)۔

اور جب اس میں بھی تم باز نہیں آتے ہو تو اسے یوں سمجھو کہ اب پھر وہ جوڈوبنے والی کشتی پہ اتنا زیادہ بوجھ آ جاتا ہے تو پھر وہ ڈوب کے رہتی ہے' اس میں پھر نہ ذرا سی تاخیر ہوتی ہے' نہ تقدیم ہوتی ہے' نہ ایک سیکنڈ وہ پہلے آ سکتی ہے' نہ بعد میں آتی ہے'

---

[1] اچھا' کوئی بات نہیں' آج تو ہمیں فرصت نہیں ہے۔ پھر کسی دوسرے وقت ہم تمہاری گرفت کر لیں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] جب تک تم صحیح راستے پہ چلتے رہو گے' تباہی سے محفوظ رہو گے۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور وہ عذاب تمہارے سر پر آ گیا تو پھر اسے کوئی نہیں ٹال سکے گا۔ اے کاش! تم خدا کے اِس قانونِ مکافات کو سمجھ سکتے۔ (ایضاً)

پھر وہ وقت پہ آ جاتی ہے۔اس وقت خدا کہتا ہے کہ موت سامنے آئے تو پھر توبہ قبول نہیں ہوتی کیونکہ اصلاح کرنے کے لیے جو مہلت کا وقفہ ہوتا ہے وہ گزر چکا ہوتا ہے اور جب وقت ہی نہ رہے' اصلاح کی گنجائش ہی نہ رہے تو پھر توبہ کے تو معنی کچھ نہیں ہوتے' پھر قوم نہیں بچ سکتی۔

حضرت نوحؑ کی درخواست

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا o فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآئِیْ اِلَّا فِرَارًا [1] (71:5-6) اب

حضرتِ نوحؑ کی خدا سے یہ درخواست آئی کہ میں نے دن رات کوشش کر دیکھی کہ یہ قوم تباہی سے بچ جائے۔خدا کا رسول اپنے دل میں انسانیت کی بڑی ہمدردی رکھتا ہے' یہ بڑا غم خوار ہوتا ہے' دن رات گالیاں کھاتا ہے' طعن سنتا ہے' مار کھاتا ہے' یہ سب کچھ برداشت کرتا ہے لیکن ان کی اصلاح کے لیے کام کیے جاتا ہے اور ساتھ یہ بھی ہے کہ بار بار کہتا ہے کہ مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ (25:57) میں اس کے لیے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔کتنا بڑا غم خوار ہے۔بہرحال حضرتِ نوحؑ نے کہا کہ میں نے دن رات اس قوم کے لیے ایک کر کے دیکھ لیا کہ یہ کسی طرح سے اصلاح کی طرف آ جائے مگر فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآئِیْ اِلَّا فِرَارًا (71:6) ہوا یہی ہے کہ میں نے ان کو بلایا اور یہ بھاگ گئے' بات سننے کے لیے کھڑے ہی نہیں ہوئے۔اس طرح یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ وَ اِنِّیْ کُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْا اَصَابِعَهُمْ فِیْ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَ اَصَرُّوْا وَاسْتَکْبَرُوا اسْتِکْبَارًا (71:7) جب بھی میں نے دعوت دی ہے' جب بھی میں ان کو بلاتا ہوں کہ آؤ! میں تمہیں بتاؤں کہ کس طرح تمہاری غلط روش تمہیں تباہ کر دے گی ان کی کیفیت پہلے تو یہ ہے کہ وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں' وہ سنتے ہی نہیں۔

لفظ ثیاب کا مفہوم

عزیزانِ من! ایک ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ بات سنی ہی نہ جائے۔دوسری چیز یہ ہوتی ہے کہ بہرحال سن تو لیا جائے مگر رہیں منافقانہ انداز سے۔یہ ایک بات قرآن نے کہی ہے۔یہ جو قرآن میں ہوتا ہے کہ اسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ (71:7) تو ثیاب کے معنی کپڑے ہی نہیں ہوتے' اس کے معنی انسان کی شخصیت ہوتی ہے اور وہ بھی جسے دہری شخصیت کہتے ہیں۔یہ معنی

---

[1] اس نے اپنے نشوونما دینے والے سے کہا کہ میں اس قوم کو دن رات تیرے راستے کی طرف دعوت دیتا رہا۔لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ میں جوں جوں انہیں اس طرف بلاتا ہوں یہ اس سے اور دور بھاگتے ہیں۔ (ایضاً)

ہوتے ہیں اس کے یعنی Dual Personality یعنی منافقت۔ اس دور میں اس کا یہ ترجمہ ہے۔ حضرت نوحؑ کہتے ہیں کہ پہلے تو بات یہ ہے کہ سنتے ہی نہیں ہیں اور اگر کبھی میری بات سنتے بھی ہیں تو منافقت اختیار کر لیتے ہیں۔ بظاہر وہ کہتے ہیں کہ ہاں ہم نے سمجھ لیا' ٹھیک ہے' ہم ایسا ہی کریں گے مگر دل سے مانتے نہیں ہیں' عمل سے وہ کرتے نہیں ہیں اس کے برعکس وہ اصـــــــرو ا ہیں۔ اس طرح وہ اپنی جو پہلی روش ہوتی ہے' یہ اسی پہ اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔ انہیں ہزار سمجھاؤ وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا (71:7) مگر وہ اپنی سرکشی میں اور زیادہ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ حضرت نوحؑ نے کہا کہ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا o ثُمَّ اِنِّیْ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا (71:8-9) میں نے کھلے بندوں بھی اعلان کر کے ان کو دعوت دی' ان کی اصلاح کے لیے یہ کچھ کہا' الگ الگ' خلوت میں بھی ان لوگوں کو بلا بلا کے میں نے یہ کچھ کیا اور یہ کچھ کہا فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ط اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا o يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ❶ (71:10-11)۔ عزیزانِ من! آگے مغفرت کی بات آتی ہے۔ حضرت نوحؑ نے ان سے کہا کہ کوئی بات نہیں پہلے تم جو لغزشیں بھی کر چکے ہو' اُن پہ گرفت نہیں ہوگی' وہ معاف کر دی جاتی ہیں' ان سے حفاظت کا سامان دیدیا جاتا ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ تم جو صحیح کام کرو گے' ان کے جو وزنی نتائج ہونگے' وہ ان کمیوں (Deficiencies) کو پورا کر دیں گے جو اس سے پہلے تمہاری لغزشوں کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ میں ان سے یہ کچھ کہتا رہا' میں نے یہ کہا کہ یہ چیز اب خدا کی پہلی نعمت ہے۔

عزیزانِ من! معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی بارانی زمینیں تھیں' آبپاشی کا انتظام نہیں تھا۔ حضرت نوحؑ نے کہا کہ پہلی چیز یہ ہے کہ خدا تمہاری زمینوں کے اوپر بھرپور بارش برسائے گا يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ (71:12) تمہارے مال و دولت میں بھی اضافہ ہوگا اور تمہارے افرادِ خاندان میں بھی کثرت ہوگی۔ اس زمانے میں قبائلی زندگی میں افراد کی اکثریت ایک بہت بڑی وزنی چیز تھی کہ قبیلے کے افراد کتنے ہیں' ان کی کثرت (Majority) کتنی ہے' آج بھی شکل وہی ہے۔ وہ جو ووٹرز کی تعداد ہوتی ہے وہ وہی ہے جو اس زمانے میں قبیلے کی کثرت کی تعداد ہوتی تھی: جتھہ کس کا بھاری ہے۔ حضرت نوحؑ

---

❶ میں نے ان سے بار بار کہا کہ تمہاری غلط روش بڑے تباہ کن نتائج پیدا کرے گی۔ تم قوانین خداوندی کی اطاعت کے ذریعے اس تباہی سے بچنے کا سامان پیدا کرو۔ خدا کا قانون تمہیں اس سے بچا لے گا۔ (اور علاوہ اُخروی زندگی کی سرفرازیوں کے' وہ تمہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی خوش حالیاں اور خوش گواریاں عطا کرے گا۔) وہ ایسی بابرکت بارش برسائے گا جس سے تمہاری بنجر زمینیں سیراب ہو جائیں گی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

نے کہا کہ خدا تمہاری اولاد میں بھی برکت دے گا' تمہاری دولت میں بھی برکت دے گا۔ پھر کہا کہ یَجْعَلْ لَّکُمْ جَنّٰتٍ وَّ یَجْعَلْ لَّکُمْ اَنْھٰرًا (71:12) صحیح انتظام کرو گے تو پھر یہ زمینیں بارانی نہیں نہری ہو جائیں گی' تمہارے ہاں باغات پیدا ہونگے' ان کی سیرابی کے لیے پانی کی ندیاں رواں ہوں گی۔

قرآنِ حکیم کا نظریہ ارتقا

پھر کہا کہ مَالَکُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰہِ وَقَارًا o وَقَدْ خَلَقَکُمْ اَطْوَارًا [1] (71:13-14) عزیزانِ من! یہاں تو بات ہی عجیب آ گئی۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ انسانی تخلیق مختلف ارتقائی مدارج سے گزرتی ہوئی یہاں تک آئی ہے۔ ہر اگلا درجہ پہلے درجے سے زیادہ سکون اور وقار اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر اضطرابی کیفیت رہے تو جسے وہ کشتی کا ڈولنا کہتے ہیں وہ چیز نہ ہو۔ کسی ایک مقام پہ کوئی چیز ٹھہر ہی نہ سکے۔ جو چیز کسی ایک مقام پہ ٹھہر ہی نہ سکے وہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ قرآن نے کہا ہے کہ ارتقاء کا نظریہ یا قانون یہ ہے کہ ایک شے ایک منزل میں آ کر کچھ وقت کے لیے ٹھہرتی ہے۔ وہاں اسے اتنی قوت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اس سے اگلی بلند منزل میں زندگی بسر کرنے کی اہل ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اگلی منزل میں چلی جاتی ہے۔ اس کے الفاظ تو یہ ہیں کہ پچھلی منزل اسے اگلی منزل میں بطور امانت سپرد کر دیتی ہے اور یوں یہ بڑھتی ہوئی زندگی آگے تک پہنچتی ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہاں تمہارا بھی یہی انداز ہوگا۔ اس وقت تم پستی کی منزل میں ہو' وہ یہاں تمہارے لیے ایسا انتظام کر دے گا کہ تم اس سے آگے' جو بلند منزل ہے' اس میں پہنچ جاؤ۔ بلند منزل کا انداز کیا بتایا؟ اس کے لیے کہا: وَقَارًا (71:13) باوقار زندگی بسر کرو گے۔ اس کے معنی ہونگے کہ یہ جو ہر وقت کا اضطراب ہے' یہ جو ہر وقت کانپتے رہتے ہو' تمہارے قدم ڈگمگاتے رہتے ہیں' اس میں یہ نہیں ہوگا۔ استحکام پیدا ہو جائے گا' جم کے کھڑے ہو جاؤ گے' تمہاری زندگی

---

[1] (میں حیران ہوں کہ) تمہیں کیا ہو گیا ہے جو اس قسم کی باوقار زندگی کی آرزو نہیں کرتے جو قوانین خداوندی کے اتباع سے مل سکتی ہے یعنی ایسی زندگی جس میں ٹھہراؤ ہو' استحکام ہوں' بخود خریدن ہو' اپنے پاؤں پر جم کر کھڑے ہو جانا ہو' محکمیت ہو' ثبات ہو' توازن ہو' یونہی ایک جھٹکے سے بکھر یا پگھل جانا نہ ہو۔ (اس سے تمہاری ذات میں بھی ایسا استحکام پیدا ہو جائے کہ وہ موت کے بعد مزید ارتقا کی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے)۔ یہ زندگی کیسے حاصل ہوگی' اس کے لیے تم قانونِ تخلیق کی کارفرمائی پر غور کرو جس کے مطابق تم مختلف تخلیقی مراحل طے کرتے ہوئے' انسانی پیکر تک پہنچے۔ (ان تخلیقی مراحل میں تمہارا ہر قدم آگے کی طرف بڑھتا گیا' اور تم اوپر کی طرف اٹھتے گئے۔ یہ سب تمہارے اختیار و ارادہ کے بغیر ہوتا رہا لیکن جونہی بات تمہارے اختیار و ارادہ تک پہنچی تم نے غلط راستے اختیار کر لیے جس سے تم پستی کی طرف گرتے چلے گئے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

باوقار ہو جائے گی۔ باوقار زندگی بڑی چیز ہے۔

لفظ وقار کا مفہوم اور آسمانی کرّوں کی مثال

عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو اب ''وقار'' کے معنی بھی کچھ اور ہی آ گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں: ''ڈگمگانا یا اضطراب کی بات کا باقی نہ رہنا۔'' اس کے دوسرے الفاظ ہیں: ''بڑا سکون ہونا' جم کے کھڑے ہو جانا۔'' یاد رکھیے! سکون جمود نہیں ہے۔ جمود تو عدمِ حرکت کا نام ہوتا ہے۔ وقار کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں کوشش بھی ہوتی ہے' حرکت بھی ہوتی ہے لیکن اس میں ڈگمگاہٹ نہیں ہوتی۔ اس قسم کی زندگی کے بیان کرنے کے لیے قرآن عجیب الفاظ استعمال کر جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ تمہیں ایسی زندگی عطا کر دے گا' تم ذرا غور تو کرو کہ خدا کے قانون کے مطابق جو کوئی بھی زندگی بسر کرتا ہے اس کے اندر اتنا وقار آ جاتا ہے کہ وہ اپنے مقام پر جما ہوا کھڑا ہے' محکم کھڑا ہے اَلَمْ تَرَوْا کَیْفَ خَلَقَ اللّٰہُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا [1] (71:15) ذرا آسمانی کرّوں کی طرف غور کرو ہر وقت مصروفِ گردش ہیں لیکن وقار کی کیفیت یہ ہے کہ ایک سیکنڈ کے کروڑویں حصے کے برابر بھی کہیں لغزش نہیں آتی' وہ اِدھر سے اُدھر نہیں ہوتے۔ وقار ہے تو اتنا' حرکت ہے تو اتنی۔

عزیزانِ من! قرآن کی کیا مثالیں ہیں! قوم ہو' اس میں حرکت بھی ہو' اور وقار بھی ساتھ ہو' قرآن نے اس کی آسمانی کرّوں سے تشبیہ دی ہے' پھر دیکھو کہ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْھِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا [2] (71:16)۔ اس نے (انہی آسمانی کروں میں سے) چاند اور سورج جیسے کرّے بھی بنائے۔ میں یہ کسی دوسرے مقام پہ عرض کرونگا کہ سائنسدان علم الافلاک والے آج یہ انکشاف کر رہے ہیں کہ سورج کی تو اپنی روشنی ہوتی ہے' چاند کی روشنی اپنی نہیں ہوتی' یہ سورج سے مستعار لیتا ہے اور پھر یہ روشنی اس سے صرف منعکس Reflect ہوتی ہے۔

---

[1] تم دیکھو کہ اللہ نے فضا کی پنہائیوں میں اِن مختلف کرّوں کو پیدا کیا ہے تو وہ کس طرح باہم دگر کامل موافقت اور ہم آہنگی سے چلتے رہتے ہیں۔ وہ اس قدر تیز گردش کے باوجود اپنے اپنے مقام پر محکم اور قائم رہتے ہیں۔ (یہ اس لیے کہ وہ انفرادی زندگی بسر نہیں کرتے۔ ان میں سے ایک کی کشش دوسرے کے ثبات کا موجب بنتی ہے اور اس طرح یہ سارا نظام فلکی بغیر کسی تصادم کے مصروفِ عمل رہتا ہے۔ ان کے برعکس تم اپنی زندگی کو دیکھو کہ اس میں قدم قدم پر ایک دوسرے سے تصادم ہوتا ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] اس نے (انہی کرّوں میں سے) چاند کو کس طرح نورانی قندیل' اور سورج کو جگمگاتا چراغ بنا دیا۔ (لیکن تم اپنی زندگی کو دیکھو کہ وہ کیسی بھیانک تاریکیوں میں گزر رہی ہے۔ اگر تم بھی قوانین خداوندی کا اتباع کرو تو نہ صرف یہ کہ تمہاری اپنی زندگی کی راہیں روشن ہو جائیں' تم دوسروں کے لیے بھی قندیل راہ بن جاؤ۔) (ایضاً)

قرآن نے سورج کے لیے ضیاء کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں: اپنی روشنی' کسی چیز کا Glow (چمکنا) کرنا جیسے خود موم بتی یا لیمپ یا جو کچھ جلے وہ اس کی اپنی روشنی ہوتی ہے۔ چاند کے لیے اس نے نور کہا ہے۔ اس کے معنی ''دوسروں کی روشنی کو منعکس کرنا'' ہیں۔ مورس بوکائے [1] (Dr Maurice Bucaille- 1920--?) سے پوچھیے۔ وہ لکھتا ہے اور ان دو الفاظ کے اوپر آ کر وجد میں آ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے دنیا کے سائنسدانوں! خدا کے لیے سوچو کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال پیشتر عرب کی سرزمین میں ایک اَن پڑھ شخص یہ تفریق کر سکے گا۔

چاند سورج سے روشنی کی بھیک مانگتا ہے

مورس بوکائے ورطہ حیرت میں ڈوب کر کہتا ہے کہ: جس حقیقت تک ہم آج پہنچے ہیں' کیا یہ قرآن کسی انسانی فکر کی پیداوار ہوسکتا ہے؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ وہ اس کے بعد یوں کہتا ہے' اور یہ عجیب چیز ہے۔ یہاں بھی قرآن نے قمر کے لیے ''نور'' کہا اور شمس کے لیے ''دیا اور چراغ''۔ چراغ کی روشنی مانگی ہوئی نہیں ہوتی' اس کی اپنی روشنی ہوتی ہے۔ ''نور'' مانگا ہوا ہوتا ہے اور اس مانگنے کے لیے تو قرآن نے یہاں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ دوسرے مقام پہ کہا ہے کہ سورج تو اپنی روشنی رکھتا ہے' چاند اس کے پیچھے پیچھے بھیک منگوں کی طرح جاتا ہے کہ ''دے جا' بابا! خدا کے نام پہ۔'' قرآن کے یہی الفاظ ہیں۔

ارتقا کے سلسلہ میں درخت کی مثال

عزیزانِ من! انسان کس کس مقام پہ کھڑا ہو کہ یہاں تو

زی فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

---

[1] ڈاکٹر مورس بوکائے Dr. Maurice Bucaille کی مندرجہ ذیل پانچ کتب لائق مطالعہ ہیں:

1- The Bible, The Quran and Science.
2- Mummies of the Pharaohs _ Modern Medical Investigation (St. Mortins Press, 1990).
3- What is the Origin of Man (Seghers, 1988).
4- Moses and Pharaoh, the Hebrews in Egypt (NTT Mediascope Inc, 1994).
5- Reflexions surle Coran (Mohamed Talbi & Mourice Bucaille, Seghers, 1989).

قرآن کا ہر مقام دامن پکڑ کے کہتا ہے کہ کھڑے ہو جاؤ' تھوڑی دیر کے لیے دیکھو کہ میں کیا کہتا ہوں۔ وَاللّٰہُ اَنْبَتَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا [1] (71:17)۔ یہ دیکھو تو سہی کہ قرآن وقار اور زندگی کی حرکت کی مثالیں دے رہا ہے: آسمانی کرّے اور درخت کی مثال ہے۔ درخت ایک مقام پہ جم کر کھڑا ہوا بھی ہے۔ اس کے وقار کی یہ کیفیت ہے اور نمود کی یہ کیفیت ہے کہ اتنے سے بیج میں سے ایک کونپل پھوٹتی ہے اور اس کے بعد وہ اتنا بڑا درخت بن جاتا ہے۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کیسے بن جاتا ہے' کس وقت بن جاتا ہے۔ اپنے مقام پہ کھڑا بھی ہے اور بڑھ بھی رہا ہے' پھل پھول بھی رہا ہے۔ یہ ہے انسان کی زندگی کہ اس کی ذات یا Personality (شخصیت) کی Development (نشوونما) بھی ہو جائے۔ وہ اپنے مقام کے اوپر قائم بھی ہوتا ہے اور اس کی نشوونما بھی ہوتی چلی جاتی ہے۔ کہا کہ اس طرح سے اس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ ثُمَّ یُعِیْدُکُمْ فِیْھَا وَ یُخْرِجُکُمْ اِخْرَاجًا [2] (71:18)۔ اور پھر زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے' مادی زندگی نہیں ہے۔ یہاں پھر درخت کی زندگی میں اور انسانی زندگی میں فرق ہو گیا۔ یہ درخت تو ایک وقت کے بعد جا کے کھوکھلا ہو کر' بس گر جاتا ہے' اس کی لکڑیاں جلا دی جاتی ہیں' وہ ختم ہو جاتا ہے۔ انسان کی زندگی یہ نہیں ہے۔ یہ بڑھتا پھولتا ہے تو اس کے بعد اگلی زندگی بھی اس کے ساتھ آتی ہے۔ یہ اسی طرح سے آگے چلا جاتا ہے۔

کرّہ ارض کی مثال

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا o لِّتَسْلُکُوْا مِنْھَا سُبُلاً فِجَاجًا [3] (71:19-20) اور تمہارے لیے

---

[1] (تمہارا باہمی ٹکراؤ اس لیے ہوتا ہے کہ تم سب اپنے آپ کو ایک دوسرے سے الگ سمجھتے ہو۔ انفرادی مفاد پرستی کی پچروں (Wedges) نے تمہیں جدا جدا کر رکھا ہے (2:36) حالانکہ خدا نے تمہاری تخلیق نباتات کی طرح کی ہے۔ (کہ زمین سے ایک تنا اوپر کو ابھرتا ہے لیکن آگے جا کر اس کی بے شمار شاخیں اِدھر اُدھر پھیل جاتی ہیں۔ اس کے باوجود' ان کا باہمی تعلق اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ جڑ زمین سے خوراک حاصل کرتی ہے' وہ اُسے اپنے لیے سمیٹ کر نہیں رکھ لیتی۔ وہ اُسے پتی پتی تک بقدر ضرورت پہنچاتی ہے اور اگر پتیاں ہوا سے نمی اور حرارت جذب کرتی ہیں تو وہ انہیں درخت کی رگ رگ تک پہنچا دیتی ہیں۔ یوں پورے کا پورا درخت سرسبز و شاداب رہتا ہے۔ پوری نوعِ انسانی کی تخلیق بھی ایک شجر طیب کی طرح ہوئی ہے۔ اس کی سرسبزی و برومندی کا راز باہمی ربط وضبط اور اشتراک وتعاون میں ہے۔ یہی ہے وہ نظام جس کی طرف میں تمہیں دعوت دیتا ہوں۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] یوں بھی انسان کی تخلیق کی ابتداء (نباتات کی طرح) بے جان مادہ سے ہوئی ہے۔ اس کے بعد زندگی مختلف مراحل میں سے گزرتی' گردشیں کرتی' انسانی پیکر تک آئی ہے۔ زندگی کا یہی ارتقائی پروگرام' موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ (ایضاً)

[3] (اُس نے تمہیں دنیا میں پیدا کیا تو اس کے ساتھ ہی تمہاری زیست کے عجیب وغریب سامان پیدا کر دیئے۔ سب سے پہلے تو کرّہ ارض پر غور کرو کہ اس نے اسے گول ہونے کے باوجود) ایسا بسیط قطعہ بنا دیا کہ تم اس کے کشادہ راستوں میں جہاں جی چاہے' چل پھر سکتے ہو۔ (ایضاً)

دیکھو تو خدا نے کیا کچھ نہیں پیدا کیا۔ زمین گول ہونے کے باوجود تمہارے لیے ایسی چپٹی ہے کہ کسی مقام پہ آ کر یہ نہیں ہوتا کہ تم گر پڑو حالانکہ ہر گول چیز کے کسی کنارے پہ جاؤ تو آدمی دھڑام سے نیچے چلا جاتا ہے۔ عجیب انداز ہے اس ارض کا کہ اتنا بڑا یہ گولا ہے کہ کبھی ہم نے دیکھا ہی نہیں ہے کہ اس کے کنارے کی گولائی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ گننا تو ایک طرف رہا' ساری دنیا کے کرہ ارض کے چکر لگا کر آ جاتے ہیں وہ کہیں نہیں بتلاتے کہ فلاں مقام پہ ہم نے اسے فٹ بال کے گیند کی طرح دیکھا کہ وہاں اس کا کنارہ یوں ہو گیا ہوا تھا۔ چلے جاؤ' چلتے چلے جاؤ' چپٹی نظر آتی ہے۔ کہنے لگے کہ اگر یہ صورت نہ ہوتی تم اس کے اوپر رہ ہی نہ سکتے' گول ہونے کے باوجود اِسے ایسا بنایا ہے کہ تمہیں محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ گول ہے۔ تم کہیں گرتے ہی نہیں ہو' پھر اسکے اندر تمہارے لیے راستے بنائے ہوئے ہیں۔ تم ان راستوں میں چلتے پھرتے ہو۔

حضرتِ نوحؑ نے کہا کہ میں اس انداز سے مثالیں دے کر ان لوگوں کو سمجھا چکا ہوں لیکن انہوں نے اس کی ایک نہ مانی 'آخر اس نے اپنے رب سے فریاد کی کہ **قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا** (71:21) او میرے پروردگار! ''جنوں پنجابی اچ کیندے نیں: میں ٹل لا کے ویکھ لئی۔''[1] میں نے انتہائی کوشش کر کے دیکھ لیا کہ کسی طرح سے ان میں اصلاح پیدا ہو جائے لیکن ہر بار' جو کچھ میں نے کہا' یہ اس کی خلاف ورزی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ میرے مقابلے میں بات اُن کی مانتے ہیں' جن کی خصوصیت اتنی ہی ہے کہ مالدار ہے' بہت بڑا خاندان ہے' ووٹ بھی بہت زیادہ ہیں' اس کے پاس دولت بھی بہت ہے' یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کہتا کیا ہے' حالانکہ اس کا مال اور اس کی دولت نے بالآخر نقصان کے سوا کوئی نتیجہ نہیں پیدا کرنا' لیکن میری نہیں سنتے' مانتے اس کی ہیں۔ **وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا** (71:22) اور پھر کمینگی کی کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ میری اس دعوت کے خلاف ایک بات کھلے بندوں نہیں کرتے' خفیہ تدبیریں کرتے ہیں' بڑی بڑی تدبیریں کرتے ہیں۔ ان کی یہ کیفیت ہے۔ **وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا یَغُوْثَ وَیَعُوْقَ وَنَسْرًا** (71:23) وہ کہتے یہ ہیں' خود بھی یہ کرتے ہیں' دوسروں کو بھی یہ کہتے ہیں کہ اس کے کہنے میں آ کر اپنے معبودوں کو مت چھوڑ دینا' نہ ودکو' نہ سواع کو' نہ یغوث و یعوق کو اور نہ ہی نسر کو۔ تو یہ ان بتوں کے نام ہیں جو غالباً حضرتِ نوحؑ کے زمانے میں یا پہلی اقوامِ سابقہ کے زمانے میں مختلف بتوں کے نام رکھے ہوئے تھے۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک خدا کی بات ماننے کی نہیں ہے۔ بس ان بتوں کو مانو' ان کو مت چھوڑو۔

---

[1] جسے پنجابی میں کہتے ہیں: میں نے انتہائی کوشش کر کے دیکھ لیا۔

بتوں کو ماننے کی وجہ جواز

آپ کومعلوم ہے کہ ان کے لیے بتوں کو نہ ماننے میں کون سی چیز مانع ہے۔ یہ بت وہ ہیں کہ آپ اپنے طور پہ' جو جی میں آئے ان سے کہتے رہیے' وہ آپ کو کچھ نہیں کہتے کہ یہ کرو' یہ نہ کرو۔ خدا کو تو اس لیے نہیں مانتے کہ وہ تو قدم قدم پہ کہتا ہے کہ یہ نہ کرو اور وہ کرو۔ وہ ایسے خدا کو کیوں مانیں' ایسے کو کیوں نہ مانیں جو ساکت مٹی کا مادھو بنا ہوا کھڑا رہے: آپ جو جی میں آئے' وہاں جا کے اس کو کہتے رہیں' وہ سامنے سے کچھ کہے ہی نہیں۔ انہیں اس قسم کے معبود چاہئیں۔ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا (71:24) یہ خود گمراہ ہوئے ہیں اور بہت سوں کو انہوں نے گمراہ بھی کیا ہے۔ ان کا دہرا جرم ہے۔ اس لیے کہا کہ ان کی یہ روش' ان کو ان کے ظلم میں' ان کی گمراہی میں' اور بڑھاتی چلی جاتی ہے۔

عزیزانِ من! وہ ایک (Momentum) (زورِ دروں) ہوتا ہے' وہ تو یوں کہیے کہ اگر آپ نے کسی کو گھمانا ہو تو پہلی دفعہ یا دوسری دفعہ بہت زور لگا کر اسے دو چار چکر گھمانا پڑتا ہے جب وہ چکر دیدیئے جاتے ہیں تو پھر اس میں اپنی ہی قوتِ دروں ہوتی ہے' اسی زور کے اوپر پھر وہ آگے چلا جاتا ہے۔ یہی کیفیت گمراہی کی ہوتی ہے۔ اس پہ شروع میں تو کچھ زیادہ زور لگتا ہے۔ جب موٹر کا فرسٹ اسپارک (First Spark) ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ پتہ نہیں اس میں کتنی بجلی صرف ہوتی ہے اور اس کے بعد تو پھر وہ موٹر خود ہی بجلی پیدا کرتی ہے اور اسی زور پہ خود ہی چلی جاتی ہے۔

پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرنے کی مثال

عزیزانِ من! یہ جو غلط روش ہوتی ہے اس کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ قرآن نے اس کو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے کی طرف آنے یا گرنے سے تشبیہہ دی ہے کہ جب چوٹی سے نیچے گرتا ہے شروع میں تو اس کی رفتار بہت تھوڑی ہوتی ہے' جوں جوں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے' رفتار تیز ہوتی چلی جاتی ہے' اپنے ہی زورِ دروں سے تباہی کے جہنم میں جا گرتا ہے۔ کہا کہ اب ان کی یہ کیفیت ہو چکی ہے کہ گمراہی کے زورِ دروں سے یہ وہاں چلے جاتے ہیں۔

اب وہ بات آ گئی کہ اس طرح سے یہ کیوں ہو رہا ہے۔ کہا کہ مِمَّا خَطِيْٓئٰتِهِمْ (71:25) انہوں نے غلط کاریاں اور خطا کوشیاں کیں۔ پھر آگے ہے: اُغْرِقُوْا (71:25) چنانچہ وہ غرق ہو گئے۔ یہ تو ہمیں معلوم ہے گو کہ قرآن نے یہاں تفصیل بیان نہیں کی' دوسرے مقامات میں کی ہے کہ اس وادی میں بہت بڑا طوفان آ رہا تھا۔ یہ بات میں دوسرے مقام پہ عرض کرونگا کہ یہ جتنی تباہیاں آئی ہیں' انبیاء کرامؑ کے جو قصے آ گئے ہیں ان تباہیوں میں جس طریق سے حضراتِ انبیاء کرامؑ

ان سے محفوظ رہے ہیں' اس میں کوئی چیز فوق الفطرت نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ان کے بچاؤ کے لیے کوئی ایسا الگ سامان کیا گیا ہے جو دوسروں نے نہ کیا ہو' یا ان کے بچاؤ کے لیے کوئی آسمان سے اترا ہو اور جو دوسری قوم ہے وہ تباہ ہوئی ہو۔ بیشتر تو وہی ہیں جن کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اس تباہی آنے سے پیشتر ان کی نگاہ نے بھانپ لیا' وہ اس مقام کو چھوڑ کر ہی چلے گئے۔ حضرتِ نوحؑ کے متعلق کہا کہ طوفان آنے والا ہے۔ یہ اس قوم کو کہہ رہے ہیں' اپنے متعلق کہہ رہے ہیں کہ پانی سے نجات کیسے ہوگی۔ کہا گیا کہ کشتی بناؤ۔ سوچیے عزیزانِ من! خدا کے لیے کیا مشکل تھا کہ ان لوگوں کو' تھوڑے سے تو لوگ تھے' یہاں سے اٹھا کر کسی دوسرے مقام پہ لے جاتے۔ یہ بچ جاتے کیونکہ ان کو بچا لینا مقصود تھا۔ یہاں سے اٹھا کے کسی دوسرے مقام پہ لے جانا مشکل کیا تھا' لیکن وہ پھر ہمارے لیے ایک نظیر یا مثال نہ بن سکتی کہ اگر طوفان آئے تو اس میں بچنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ پہلا طوفان آیا ہے' پہلا ہی نبی ہے جس کو کہا جاتا ہے کہ ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ۔ تو نظر آتا ہے کہ معاملہ ابھی ایسا تھا کہ انسان نے کشتی بنانا بھی نہیں سیکھا تھا' جبھی کہا کہ ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ۔ عزیزانِ من! کشتی بنانے کے لیے بھی وحی آتی تھی اور پھر یہ بھی کہ ہم نگرانی بھی کرتے جائیں گے' دیکھتے جائیں گے کہ ٹھیک جگہ تم کیل لگاتے ہو' ٹھیک جگہ یوں تختہ لگاتے ہو لیکن بنوائی ہے کشتی ہی' کشتی کے ذریعے سے ہی اس طوفان سے نجات دلائی ہے۔ آج بھی یہ صورت ہے کہ غلط نظام کی وجہ سے تباہیاں تو آئیں گی لیکن تباہیوں سے بچنے کے لیے سامان اسی قسم کا پیدا کرنا پڑے گا۔

قرآن نے کہا کہ وہ غرق ہوئے کیونکہ مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ (71:25) انہوں نے غلط کاریاں اور خطا کوشیاں کی تھیں۔ اپنی غلط روش کی بناء پر وہ غرق ہوئے تھے۔ غلط کاریوں اور غلط کوشیوں کی بناء پر وہ غرق ہوئے تھے' تباہ ہوئے تھے۔ وہاں یہ ہے کہ حضرتِ نوحؑ بیٹھے کشتی بنایا کرتے تھے اور وہ ان کے ہاں کے بڑے بڑے جو سردار تھے اگر وہ اپنی قوت کے نشے میں بدمست نہ ہوتے تو کھڑے ہو کر کسی وقت پوچھتے کہ یہ کیا کر رہے ہو' تم یہ کیا چیز بنا رہے ہو' کیوں بنا رہے ہو' اس کا کیا فائدہ ہوگا' سمجھنے سوچنے کی صلاحیت باقی رہتی تو انہوں نے بھی کشتی بنائی تھی وہ بھی بنا لیتے۔

نشہ قوت انسانی صلاحیتوں کو سلب کر دیتا ہے

عزیزانِ من! لیکن قرآن بتاتا یہ ہے کہ یہ جو قوت کا نشہ ہے' یہ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ اس میں انسان کے ہوش وحواس گم ہو جاتے ہیں' سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ وہ دیکھ رہے ہیں اور مذاق کر کے آگے بڑھ رہے ہیں کہ اس کی مت ماری گئی ہے' یہ کیا کر رہا ہے۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ غرق ہوئے کیونکہ ان کی ذہنیت یہاں تک بگڑ چکی تھی کہ عام فہم و فراست' عقل وفکر اور بصیرت کی رو سے جو چیز انسان سمجھ سکتا ہے ان میں وہ بھی باقی نہیں رہی تھی۔ قوت کا نشہ عام فہم

وفراست اور بصیرت کو بھی سلب کر دیتا ہے۔ اکھاڑے سے باہر کھڑے ہوئے وہ لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں اور کہہ رہے ہوتے ہیں کہ صاحب! دیکھو اس کی سمجھ میں اتنی بات بھی نہیں آ رہی۔ عزیزانِ من! ان کی سمجھ میں اتنی بات بھی نہیں آ رہی ہوتی۔

حضرتِ شعیبؑ کو اُن کی قوم نے یہی کہا تھا کہ شعیبؑ! تم یہ جو کچھ کہتے ہو کہ اس کاروبار میں دیانت برتو' تمہاری یہ باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ آپؑ انہی کی زبان میں بات کر رہے تھے' انہی میں سے تھے' پھر یہ کہنا کہ تمہاری بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی ان کی بگڑی ہوئی ذہنیت کی غماز ہے اور واقعی' یہ جو اونچے اونچے اڑتے ہیں' نیچے والوں کی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہاں کہا گیا ہے کہ وہ اپنی خطا کوشیوں کی بناء پہ غرق ہو گئے۔ **فَاُدْخِلُوْا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا** [1] (71:25)۔ وہ آگ میں جھونک دیئے گئے۔ ہمارے ہاں یہ تصور ہے کہ یہ کچھ قیامت میں ہوگا۔

عزیزانِ من! وہ قیامت اور اس کی جہنم اپنے مقام پہ ہے' وہ اس سے الگ ایک عذاب ہے' مگر یہ قیامت' یہ عذاب تو اس دنیا کے اندر ہے۔ آگے یہ بات بتا دی کہ **فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا** (71:25) پھر خدا کے سوا ان کا کوئی بچانے والا نہیں تھا اور خدا نے بچانے کا جو طریقہ بتایا تھا وہ انہوں نے مذاق میں اڑا دیا تھا۔ جب کیفیت یہ ہو تو پھر تو کوئی چیز بھی باقی نہیں بچتی۔ آپ اندازہ لگائیے کہ وہ کس مقام پر پہنچے تھے۔ ایک غم خوار دل ہے جو ابھی ابھی کہہ رہا ہے کہ یا اللہ! میں نے دن رات ان کے بتانے کے لیے ایک کر دیا لیکن انہوں نے ایک قدم بھی اصلاح کی طرف نہ اٹھایا۔ وہ پوری کی پوری قوم اس حد تک سرکشی میں آگے بڑھ چکی تھی اور ان کے جرائم ایسے متعدی ہو رہے تھے کہ دوسرے انسانوں کو ان کے اثرات سے بچانا نہایت ضروری تھا۔ اس مقصد کے پیشِ نظر **وَ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا** [2] (71:26)۔ یہ سرکشی میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں' ان میں سے کسی ایک کو بھی نہ چھوڑ۔ یہ ٹھیک ہے کہ مقام ایسا ہی آ گیا ہوگا۔ وہ بھی خدا کے نبی تھے۔ معلوم نہیں اس قوم کی کیا کیفیت تھی جس کے لیے آگے خدا بتا رہا ہے۔ میں ابھی اس پر آتا ہوں لیکن بات دوسری طرف آ گئی پہلے میں وہ بتا دوں۔

---

[1] اور پھر جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ سو انہوں نے دیکھ لیا کہ خدا کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں تھا۔ (وہ جن بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے نہ تو وہ ہی ان کی مدد کو پہنچے اور نہ ہی وہ لیڈر جن کا وہ اتباع کرتے تھے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] نوحؑ نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ ان سرکشوں میں سے کسی ایک گھرانے کو بھی ملک میں بسنے کے لیے باقی نہ چھوڑ۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کسی کو چھوڑ وتو وہ بھی حسن کارانہ انداز سے چھوڑ و

نبی اکرم ﷺ سے بھی یہ کہا گیا تھا: وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلاً [1] (73:10) ان میں اب کسی قسم کی اصلاح کی گنجائش باقی نہیں رہی' اصل تو یہ ہے کہ ان میں بچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی ہے' اس لیے اب ان سے اعراض برتو' ان میں اپنا وقت ضائع نہ کرو' یہی وقت کسی اور تعمیری کام میں صرف کرو' مدینے چلے جاؤ' ان کو چھوڑ دو' لیکن انداز یہ ہے کہ هَجْرًا جَمِيْلاً (73:10) چھوڑ وبھی تو بڑے ہی حسین انداز سے چھوڑ و' یہی نہیں ہے کہ کسی کے ساتھ دوستی کرو تو حسن کارانہ انداز سے کرو۔ قرآن کی تعلیم کا اندازہ لگاؤ کہ ان کو چھوڑ وبھی تو حسن کارانہ انداز سے چھوڑ و۔ اور آگے وہ فرق ہے جس کے لیے میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ میں اس کی طرف آتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ ان کو چھوڑ وبھی تو قرآن کی بات ان تک پہنچاتے جاؤ تاکہ یہ نہ ہو کہ ان میں سے اگر کسی میں بچنے کا امکان ہے تو وہ اس لیے ختم ہو جائے کہ قرآن کی آواز ان تک نہیں پہنچی تھی: چھوڑ و' جمیل انداز سے چھوڑ و' اور قرآن کی آواز اس کے باوجود پہنچاتے رہو۔ اس میں رسول کی غم خواری اور خدا کے رؤف ورحیم ہونے کی دونوں چیزیں آجاتی ہیں۔ خدا کے لیے تو ہم غم خوار اور غم گسار جیسے الفاظ بھی استعمال نہیں کر سکتے لیکن ہمارے پاس اور الفاظ کیا ہیں! آخری انداز میں تباہی کے جہنم میں گرنے لگتا ہے تو اس وقت بھی خدا بڑے حساس انداز سے کہتا ہے کہ میرے بندے! تم نے اپنے ساتھ کیا کر لیا۔ یہ کسی ظالم اور انتقامی کا انتقام نہیں ہے کہ بیت پڑیں اور وہ خوش ہو کہ اچھا ہوا' تمہارے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ کہتا ہے کہ او میرے بندو! یہاں اس نے حسرت کا لفظ خود استعمال کیا ہے۔ تو گویا یہ کیفیت ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے کہا ہے کہ ان میں اصلاح کا امکان نہیں ہے' ان کو چھوڑ دو اور اس کے بعد ان سے یہ کہا ہے کہ قرآن بھی پہنچاتے رہو۔ یہ جو کہا تھا کہ ان میں سے ایک کو بھی نہ چھوڑ' اس سے آگے کہا کہ اِنَّکَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَکَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (71:27) اس لیے کہ مجھے ان کا اندیشہ ہے کہ یہ ایسی سطح پہ' ایسے مقام پہ' پہنچ چکے ہیں کہ اگر کوئی بھی ان میں سے باقی رہا تو یہ اس کے بعد دوسروں میں فتنہ پھیلاتا چلا جائے گا اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ اسی گمراہی کی حالت میں' فسق وفجور میں مبتلا رہے تو ان کی اولاد بھی اسی قسم کی ہوگی۔ اس لیے ان کا سلسلہ ہی ختم کر دے کہ نوعِ انسانی بھی آگے چلے تو صالحین کی اولاد ہو جو آگے چلے۔ یہ بڑی چیز کہی ہے اور واقعی وہ اولاد بھی اسی قسم کی ہوتی ہے۔

---

[1] اپنے مخالفین کی طرف سے صرف نظر کرتے ہوئے' اپنے دامن کو ان خاردار جھاڑیوں سے' حسن کارانہ انداز سے بچاتے ہوئے' الگ ہٹتے چلے جاؤ۔ (ایضاً)

حضرت نوحؑ نے کہا کہ رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا (71:28) اے میرے پرودگار! حفاظت کا سامان مجھے دے' میرے والدین کو بھی دے' وہ مومن ہونگے کیونکہ جو بیٹا تھا وہ تو ان میں سے نہیں تھا۔ اور لِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا (71:28) یہ نہیں ہے کہ جو میرے گھر میں آ جائے اس کو بھی محفوظ کر دے' حفاظت دیدے' نہیں۔ بلکہ ایمان کے ساتھ جو میرے گھر میں داخل ہو' اس کو بھی حفاظت دے۔ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ (71:28) تمام مومنین کو' تمام مومنات کو وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا (71:28) اور ہم جانتے ہیں کہ یہ جو ظالم ہیں' ان کے اوپر جو تباہی ہے' یہ تو بڑھتی چلی جائے گی اور یہ ختم ہو جائیں گے۔

اعلان

عزیزان من! سورۃ نوح کا اختتام ہوا اگلے درس کی بات بڑی اہم ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ جو قوم اپنے محسنوں کو یاد نہیں رکھتی پھر اس قوم میں محسن پیدا ہونے بند ہو جایا کرتے ہیں۔ ہمارے اس دَور میں میری نگاہ سے تین محسنین گزرے ہیں: سرسید احمد خاں (1898-1817ء)' ڈاکٹر محمد اقبال (1938-1877ء)' اور قائداعظم محمد علی جناح علیہم الرحمۃ (1948-1876ء)۔ یہ ہم پر ملتِ ہندیہ مسلماں کہہ لیجئے' یا پاکستانیہ' پر بہت بڑا احسان ہے۔ پچیس دسمبر عام طور پہ قائداعظمؒ کا یومِ پیدائش ہوتا ہے۔ اس پہ بھی میں ایک خطاب پیش کیا کرتا ہوں تو پچیس دسمبر نہیں بلکہ ہم جمعہ کے دن یہ کیا کرتے ہیں کیونکہ درس کا وہی دن ہے۔ اگلا درس تیس دسمبر کو آئے گا' تو تیس دسمبر کا جو درس ہے' اس کا خصوصی عنوان ہے: ''منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے۔'' جنہوں نے پاکستان کی اتنی مخالفت کی تھی' یہ فطرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ وہ آج پاکستان کے مالک بنے پھرتے ہیں۔ میں پاکستان کی تحریک میں شامل تھا۔ اسے یوں کہیے کہ مجھے وہاں ساتھ شامل رہنے کا شرف حاصل ہے تو میں پاکستان کی تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ کچھ عرض کرونگا کہ جن لوگوں نے وہاں تحریک پاکستان کی' مطالبہ پاکستان کی' قائداعظمؒ کی' اقبالؒ کی' اتنی مخالفت کی تھی' وہ جو آج یہاں' آپ کے ہاں' پاکستان کے اقتدار کے حصول کی ہوس لیے بڑے معتبر بنے پھرتے ہیں۔ یہ تمام علماء حضرات' یہ تمام کسی قسم کے جتنے بھی سیاسی لیڈر آپ کے ہاں نمایاں طور پہ نظر آ رہے ہیں' انہوں نے بڑی مخالفت کی تھی۔ اس خطاب میں' میں یہ عرض کرونگا کہ انہوں نے پاکستان کے مطالبہ اور تحریک میں کس طرح مخالفت کی اور یہاں آنے کے بعد پھر کس طرح انہوں نے کہا کہ صاحب! یہ سب کچھ

ہمارے ہاتھ میں دیدیجیے۔ سچ تو یہ ہے کہ ''منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے''۔ ان احباب نے اس کے کارڈ چھپوا لیے ہیں اور آپ احباب نے تو یہ اعلان سن لیا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀.....❀❀❀.....❀

JOURNEY OF MY LIFE

By

Dr. Shaguftaa Tahir, Karachi

Wajud-e-zan say hai tasweer-e- kaainaat may rung
The universe gets its beauty from Female's existence
Usee kay saaz say ahi zindagi kaa soz-e-darun
It is her music that is the essence of tender life–Iqbal.

God has bestowed the tender gender—Woman—with gifts of emotions and feelings. When she plucks the strings of her 'being' in the quietness of nature, all sorts of different colours and shades vibrate to join in. When observed dispassionately, away from the prejudices of, race, colour and geography, she is found to be struggling to step beyond her shell.

When the Creator of the Universe created her, it instilled in her all the necessary attributes of femininity that were required to help run the word's scheme- of- things. Who else but the Creator can analyse what her position and status should be? At what level she should be placed in the workings of nature? On one hand she is a fellow traveler for Male, a corner of tranquility and comfort of life and on the other hand she seems to be a picture of blessing where in 'a little acorn grows in to mighty oaks'. To protect them she has the courage to tackle mountains. So, has this being acquired her true place in the world?

Dear readers, the subject on which the Creator has put pen to paper, making Rule and Regulation for its creation, it has preserved those in the Quran, addressing humanity as a whole. To quote Iqbal, 'if I did not know the Quran or were a non-Muslim, I would have said that the book was written by a female to give her own self that higher position which no other religion has given her!!!'.

With a little thought, we would not have to go far to see at close quarters the picture of her desperation. This 'being', who's existence the Poet of the East attributes to have beautified the universe; how the culture of 'Man' has her degraded. It is not a secret for us all to see. Whether they are the fortifications of traditions or the sentinels of religions, are all meant to keep her on straight and narrow. Cast a glance at any part of the world

or religion, woman will be found to be struggling for her basic Human-rights. So let us ask, why is it so?

The one who should have been given her Human Rights, failed to acquire them! Despite the fact the Lord had often times sent His messengers to elaborate them. This message was endorsed by many Messengers and again confirmed through the 'Seal of Messengers'. All religions had changed the basics of the message. The Ajam(non Arab lands) too did not lag behind to join in this wicked conspiracy.

After having included all the falsehoods in their explanations of Quran, they then proceeded to issue such Fatwas (edicts) that no body would dare to question even though they were allegations against God Himself. The Quran itself gives evidence of corruption in this concocted corpus which, are quoted as evidence of Quran being-- God forbid-- as incomplete document. This very corpus (it is insisted) should be used to understand the context, otherwise; firstly Quran can not be understood without these stories and if it were to, the Devil would lead one astray and thus one would be ostracised from Islam, therefore, one must not use one's intellect, in particular to understanding of the Quran, they say.

What ever the (long departed) elders-of-the-Deen, the religious lawyers and scholars had written, was the distillation of their life-time work and so what ever they had preached must be followed. Because these stories as such were hand-me down from Torah and Bible under a well thought out conspiracy, they were included in the 'Traditions/hadis' corpus and are associated with these elders.

Any research on them is even forbidden. Thus all factions are locked in their own hear-say, and therefore each faction considers the other faction as infidel. Now consider this, if these instructions were Islamic, then would not the Messenger himself have established them and would God not have endorsed them? However this we have to admit that the hearsay Islam has destroyed the analyses of Islam and of the Muslim-people, and we can not brush aside the fact that we have to investigate these people who are supposed to be the custodians of Quran and that the promise of heaven is through them only?

The word of the Creator-Cherisher of universe even today reflects as a clean mirror and can show every body's reflection clearly, on the condition that one wants to see it. How far have the Muslims been successful in this,

is but quite obvious. The way they have projected their cultural, society and family/domestic practices to the world at large; unfortunately one must say, the female gender in it, is ashamed of even being a woman. Shackled in the falsehood of religions, she endeavored to find a messiah; she did find some support but never could find a true companion or fellow traveler. Today the very meanings of these words are changed. We have no idea of self respect nor do we value the importance of maintaining the dignity of others. What is preferable to us is the standard of our false status as seen by others. All standards given by Almighty seem to be made suitable for others to surmonise us with. To implement them for one self, it would be necessary to make further changes to them.

Please contemplate how this duality of standards has inflicted deep wounds on our basic values.

When we contemplate on the scheme of God's creation, we see that He has created every thing in complementary pairs; for example in plants, animals and minerals; even such as day and night, heaven and earth, hot and cold, light and shade and so also the complement of this world is given as the Akhira. Then what is so strange in the pairing of man and woman? Quran refers to these pairs as complementary. But alas, we only have a 'wife' in our vocabulary never a partner(spouse).

No animal in the world has maintained such discriminatory relation as has the mankind with the female gender. Watch the life of a lion and lioness. No discrimination there. Both eat the same type of hunted food, live in the same environment; only the responsibilities of propagation of species differ, which is ingrained as instinct in female nature. Never will we see the lion growl, stare in anger or dominate the lioness. Both will be seen to live in their own limits of duties.

Human kind is a social animal who is not endowed with instinctive self, which differentiates it from others animals. That 'self' needs to be cultivated. This cultivation is imposed as the responsibility on the society and parents. This training programme starts from mother's lap to end at the brink of grave. God has not abrogated these responsibilities, for He sent His Messengers to guide mankind. When ever mankind was drowning in sin, He opened the doors of salvation. Mankind having successfully gone through this training is then referred to as Momin and Mominaat –believers includs both genders. He conveys eternal bliss for both.

We know that there are at least four female relationships that have an effect on man's life. That is there is a clever and capable woman behind a successful man-- and so we can say there is a visionary man behind every successful woman too. If a mother, then her lap is the first training ground for the child from where it obtains the art of successful life. In this nest it flaps its wings for flight. When it joins the hustle and bustle of the world, it becomes an aviator who tests himself for confidence prior to taking mankind safely in the outer space. This Momin-being is called Alim-a scholar- in the context of Quran.

Nations make their destiny in mothers lap. Almighty God has implemented rules and regulations for the training of this mother and for her security and protection has created the Man. For, after providing the training of this being, even as a sister, wife or daughter, 'will ever Nargis make the garden fragrant' and play her music of happiness. She would not then shed tears on her lack of sight as to when, where and in which century will come a visionary who might bring a revolution in the world.

After contemplating the needs and purpose of this issue, we wish to analyse the reasons why then Man did not establish the relationship with the female gender for which he was created??? Before raising it on the pedestal of nobleness, mankind was equipped with Wisdom, Understanding, Will and Capability, so that when thrust with responsibilities, it should find no way of escape.

One would not be particularly pleased to know that the weaker gender in this rainbow world we talk about has ever found a sanctuary any where. History of million years is a witness that if ever the rights of any were trampled upon, it is the female's. If ever any human enslaved another, it was the Man who shackled this fellow traveler. A tender, kind hearted and innocent, harbouring many dreams, she has been turned by Man into a stupid, unintelligent, weakling and responsible for the 'original sin'. And then designated him as superbly-blessed, blue-eyed-boy of creation and the very reason for which this Universe was created. As a result the female herself begins to believe that it is her fault and destiny to be at the bottom of the rubbish heap. Her thinking power was reduced to the extent that she forgot to demand her given human-rights. One does not have to go far to see how badly she is treated. Even in today's scientific twenty first century the way she is oppressed, not even one tenth of it is allowed to come to the surface.

According to Christianity, woman was kicked out of heaven for her Original Sin. Esquire Adam too was sent packing from there because of her. In the gospels, the female was created as a play thing for him and that too from the most crooked left rib of his. So it is established that it is very difficult indeed to straighten the female. In fact, it is well-nigh impossible. She can not be straightened, but can be broken, or she can be just tolerated; yet there is always that danger of being branded as 'a softy' to have to do so.

It is a different matter when mere attraction turns into an infatuation for her and so he runs around with his lapel torn. Even then he heaps his deranged state of mind on the poor woman, herself a creature tormented for generations. Do you agree that it is a heart wrenching story! The cry of our Piety-brigade can be heard that --*they do what they will, yet 'heap the bucket' on us.*

The cruel practice of the Arabs was to burry their girls alive, but the progressive Western culture is no less cruel where the female does not find security under any canopy, so much so that a daughter is not safe from her father and brothers.

Our progressive culture is strange in that it considers a daughter's journey from birth to adolescence as a responsibility and a burden and endeavors to cast her off in haste. It is commonly acknowledged the difference in the upbringing, education, training and feeding of sons and daughters. Some will scream that- 'No! no such things happen among us. We consider a daughter as God's blessing'. But when the question of a daughter's bride-gift, division of estate and if the girl expresses her wish to marry a person of her choice arises, particularly then, how much her wishes are respected, is not a secret.

We are indebted to Hindus. Our social system is a store house of the influences of their culture. Wrapped in silken clock of religion we take revenge on past and present generations in that environment. Being very sensitive, we turn a slightest incidence into a tempest of ego for the society to deal with. But fail to extract from that typhoon a smallest shell that should show us the way forward for action. In the domestic world strange stories give birth, stories which are based on strained relations, enmity, revenge, and jealousy, all misdirected emotions. What has knowledge based and guided upbringing, which is the foundation of human development got to do with such trash?

Where as Islam establishes the relationship of Humans with Almighty, it also lays down the solid pad for domestic and family relationship in which man and woman make a blissful life. The responsibilities it has imposed on each other, includes the maintenance of dignity and rights for each. The household where there is freedom of thought and life organized based on knowledge; there only the younger generation can obtain proper guidance.

Islam rejects the notion that Eve was created after Adam and from his ribs. *"God has created you from one life source and created from it many compatible beings"* that is to say that life source got divided in to two and " *from these many males and females were spread round the world 4:1".*

The single self or the one cell, progressed through developmental stages in organism and limbs to appear in the shape of mankind; through the two genders and from the mothers womb. Hence they are similar in all aspects of life. Then the Quran says *" from whence We created complementary partners for you 30:21'42:11"*

The 'spouse' or partner is said to be complementary partner/friend, a spouse who completes both and makes them whole and further it said "*you are from each other 3:195*". None alone can be whole without the other.

Quran also refutes the allegation of the Christians that the female is responsible for leading the male astray. And that she was misled by the Devil and so was responsible for Adams expulsion from heaven. Quran elaborates that *"the Devil misled both simultaneously2:36".* Thus they both share the blame for having sinned, then they both asked for forgiveness and so both are made *worthy of Dignity70:71.* This means that not only the male but the female too is worthy of dignity.

Entire life for humanity depends on balance in nature. Is it then possible that this balance is made dependent on one gender only, either the male or the female? Customarily the balance is considered as through one gender only, any wonder then that we see imbalance in our society! We consider only one half as constituting humanity. Then too one half is graded such that 99% is separated and only one per cent remains to make up the higher grade.

As was said before, that one status the female has been given by nature, is that of giving birth, thus the making of a nation, which is solely dependent on her capacity to do so. This specialty is the society's absolute necessity. What ever type will be the mother, will the society be constituted of. That is the reason why Quran uses the word Ummah for society. The root of this word is Umm which means mother. With such a heavy responsibility on her, is it then not a suicide of a nation to hinder and restrict her upbringing and development?

Today's girl is tomorrow's mother. If her health, education, freedom of thought, independence and understanding, is usurped, can she ever dream of elevation and higher status for herself??? Certainly not!!! Dr Iqbal has said:

Jis ilm ki Taaseer say zan hoti hai nazan
The effect of the education that robs a female's femininity
Khetey hain issi ilm ko Arbabey nazar maut
The visionary Scholars call such education as 'death'
Begaanah rahey Deen say agar madrasaa-e-zan
If the girl's-schools were to be neglectful of Deen
Hai ishq wa muhabat kay liye ilm wa hunar maut
For love and affection this knowledge and craft is 'death'

The responsibility of her education and training has been put on the male. Says Quran --*"The procurement of sustenance, in general, is the responsibility of man. For this he has been given additional skills and women different skills 4:34".* Therefore the man has been instructed to provide from his earnings for the needs of women. (*Qaa'ma alaiha* means to provide her with sustenance) so that she fulfils her responsibilities too, including those of child rearing, the capability of which has been given to her off-sight. However this has been translated to mean as—'righteous wives are obedient to husbands and men are placed as constables on them. Women should guard their modesty and their honour in men's absence)' as if this is only required of woman, although in Chapter Ahzaab's verses in Quran it is incumbent upon both gender to do so. This notion is therefore false because the relationship between man and woman is that of partnership. Such anomaly in a partnership can not exist in one part being 'subservient' to the other!!!

Both men and women are enmeshed in the workings of this world and are locked in the laws of God. Both are part of the community or the nation.

The relationship of Master and Slave is vehemently condemned by Quran and the attainment of heaven is assured only through individual's Righteous actions, and as such heaven is obtainable to both. The laws of nature can not be changed preferentially for the mere fact that one is born a male.

Fard qaim rabt-e-millat say hai tanhaa kutch nahin
Individual exists due to the coherence of community
Moj hai daryaa may aur beru-e-daryaa kutch nahin
A wave exists but in the ocean, out of it has no existence

Let us proceed to the next part of the verse and we find the ruling as to what action a husband can take on the wife acting disobediently. We take the following ruling from conventional translations. Here it is considered necessary to investigate if this ruling exists in Quran or not.

Of those women you fear excesses, so advise them and confine them in their bedrooms and beat them. If they obey you then do not go heavy on them, indeed God is great 4:34.

It is found from the beginning of the verse that the subject is not of family or a domestic dispute but it is where Almighty is laying down rules and regulation for interactive responsibilities of man and woman within a society. Man is made 'the provider' and woman 'the keeper of the Home', where she rears the young, develops her own person and benefits from the facilities given of education and training. But if she, in spite of all these facilities, goes astray then she should be counseled, then house bound as a further counseling and failing this as a last resort further action is taken through the court, which within limits of law, is empowered to give appropriate punishment.

Dear readers, we all know how a husband, behind the facade of male-authority humiliates her person, alleging disobedience to him for not caring for his parents and siblings according to his expressed wishes. In our society, has any civil or community court ever decreed as to what are the limits of punishment for a woman for disobedience to her husband???

A man is not even considered 'disobedient' (guilty) when he does not provide for her and children's basic sustenance. Neither the society nor the religious factions then punish him. Man, with no questions asked, imprisons her in the house such that she can not even attend the funeral

of her parents. Who then comes to her aid? This we witness every day, there is no exaggeration here. Has the husband ever been challenged for the demands he makes of her, and where is it ordained in the God's laws?? No, never!!!

The common occurrence is, this woman is beaten by her husband, the family according to their ability some times abused verbally, sometime burned with the help 'of a stove', some time with a bed-sheet and some times sacrificed to the concocted traditions of 'karokari' to murder her. No body comes to know of it or cares. At best they punish her with 'life' sentence to make it an eternal hell for her!

Few days ago, two ladies were murdered (in Pakistan). No investigation was carried out by any court nor by the authorities. Thus the women were sacrificed on the alter of Man's- ego. Will not God ask about this case as to why the women were murdered *81:9*??? Please answer—if the other religions have branded her sinful and shameful, degraded her bellow the status of humanity, then it is true that the custodians of Islam have not considered her as worthy of mercy too?

For years non-Muslims scholars were confounded for they were debating whether a woman has a soul or not. To these thinkers, the soul is pristine and so a woman--being impure-- could not posses it, only a man could have a soul. So it is also a question as to what protection the Code of Islam has given her???

Thus far we have been analyzing one verse to determine the chaos created in the society, which has no empathy to offer; for the concocted and as practiced Islam has even established their correctness from Quran, to say that, if she disobeys you, then beat her, but in the exegesis a sort of kindly allowance is made to her that no mark should be left on her body!

When in rage only then one does come to blows; who then remembers what happened. Who cares for the left over ashes after the bush-fire has passed???

Quran imposes self control, gratitude, relationship and gives lessons of love. The woman devoid of education, brain-dead for the last fourteen hundred years of our history, for its diagnoses, perhaps this is not the place!

However, did our Shariya courts ever ruled in the context of man-woman's working of their relationship according to the rulings of the Quran??

They obtain proof from their customs and rulings from the religious lawmakers (of the past), according to whom the women really should be proud of being obedient servants of the men. If she is kept as a slave by him, even then she should not complain. A book called 'Beheshti zewar' by Ashaf Ali Thanwi will provide further details of this (mind-set). That is why one will find on the deep dark pages of life, womanhood howling in pain and anguish, irrespective of her social status, place and language. Only a fraction of a percent may have obtained their Rights, but in this world those who are ground between the two mill stones, are innumerable. In the environment where her right to speak is locked , wisdom and understanding capacity constricted; from such a lap it is not possible to cultivate the likes of Muhammad bin Qasim , Tariq bin Ziyad , Qaid-e-Azam or Dr Iqbal! The sort of child-personalities that would emerge from this enslaved and handicapped mother's lap, one can only guess!!!

Quaran's ordinances are fixed and there is no room for any change in them. Is not now necessary to consider as to why we are so wretched. The poet of the East has said:

Hai kis kee yeh jurat khey Musalman ko tokay
Who dare growl at a Musulman
Huret-e-afkaar kee na'mat hai khudadaad
Freedom of thought is God given blessing
Quran ko baazicha-e-taaweel banaakar
Converting Quran in to an Exchange mart
Chahey toe khud aik shariet karay ejaad
They wish to invent a new religious code
Hai mamlikat-e-Hind may iktarfaa tamaashaa
There is one sided pantomime in the State of Hind
Islam hai mehboos Musulman hai azaad
Islam is imprisoned though Muslim is free

The outcry for woman's right may have given impetus to sexual waywardness but the system of life in terms of economic and societal matters is taking a ruinous path.

The woman unfortunately is not aware of her own rights, so the rights she is claiming have now included all those additional responsibilities that

were once male's domain. She now earns for the man, and along with that is burdened to provide for the rest of the family too. Hence woman's own life is even more difficult.

The Western civilization has converted her into a society-flame and placed her at various places so that copious entertainment can be provided for man, as a result none is found to be genuine and both are now lonely. Neither the pure love of parent is there nor the innocent love and affection of siblings exists. It is inevitable that when in the partnership, love and loyalty which are the foundation of a marriage 'home' are destroyed, the balance of the society is bound to be ruined. This man-made system can never with justice allocate responsibilities. As God has warned that a woman can hardly present her own case, for you have decked her in ornaments, so in disputes she can not even present her purpose of being 43:18.

Let us then think, when God Himself is concerned about the plight of His creation and describes her nature clearly then would He abandon her at the mercy of mankind??? No, never, it can not be so!!! To believe so is it not a slander on Almighty???

Quran has elevated the woman to the position of the 'female-believer', up above the depth of mankind and foretold of the eternal bliss through her. Having ordained all her Rights divinely, He made the male responsible to provide her those rights in practice. It is a trust that Almighty has placed upon the male believers. Those who fulfill this trust will inherit this world's and the hereafter's heavenly bliss. Their fields will be fertile and gather golden harvest. Such societies can only prosper with Almighty's blessings. It is not within the capacity of mere man alone to do so!!! According to the poet:

Jinhen haqeer smajh kar bujhaa diya tuney
Those that you extinguished as mere ordinary
Wahi chiraag jalengey toe roshni hogee
Only with those lamps there will be a light when lit.

==========